PAGES MISSING
WITHIN THE
BOOK ONLY

188432

سلسلۂ نصابات تعلیمیہ جامعۂ عثمانیہ

تاریخ ہند

کتاب چہارم

برائے انٹرمیڈیٹ

مؤلفہ

مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی

رکن سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۳۴۱ھ سنہ ۱۳۳۲ف سنہ ۱۹۲۲ء

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین
کتاب چہارم تاریخ ہند

باب اول نئی طاقتیں۔ صفحہ ۱ تا ۳۰

۱۔ مرہٹوں کا فروغ :۔
مرہٹوں کی ریاست۔ ۲۔ پیشوا کا اقتدار ۳۔ گجرات و مالوہ میں نفوذ۔ مرہٹوں کا دخل شمالی ہند میں ۶۔ مرہٹہ قوت کا زوال وانتشار ۹ تک

۲ حیدر آباد (و میسور)
خاندانِ آصف جاہی ۱۱۔ دکن سے ابتدائی تعلق۔ نواب نظام الملک آصف جاہ اول ۱۱۔ اندرونی نظم ونسق ۱۳۔ آصف جاہ کے جانشین ۱۴۔ جنگ کرناٹک ۱۵۔ فرانسیسی نفوذ دربار دکن میں ۱۵۔ نواب نظام علیخاں آصف جاہ ثانی ۱۶۔ انگریزوں کے تعلقات ۱۷۔ میسور کی آزاد ریاست ابتدائی تاریخ۔ حیدر علی کا تسلط ۱۹۔ حیدر علی کی فتوحات ۲۰۔ ٹیپو سلطان ۲۱ تک

۳ شمالی ہند کی ریاستیں :۔
(۱) بنگالہ ۲۲۔ علی وردی خاں ۲۴۔ (۲) اودھ ۲۵۔ انگریزوں کا اثر ۲۶۔ (۳) پنجاب ۲۷۔ سکھوں کی بارہ مسلیں۔ رنجیت سنگھ ۲۸۔ فتوحات ملتان وکشمیر وغیرہ ۲۹ تک

باب دوم: اہل یورپ کی آمد ہند میں۔ ۳۱ تا ۵۳

۱۔ مغربی ممالک سے بحری تجارت کا آغاز تک
پرتگیزوں کے سیاسی منصوبے ۳۱۔ فتح گوآ ۳۲۔ پرتگیزوں کا زوال ۳۳۔ ولندیزیا ڈچ ۳۴ دیگر فرنگی اقوام کی تجارت ۳۵ تک

۲۔ انگریزی کمپنی کے ابتدائی حالات :۔
بحری تجارت کا آغاز ۳۷۔ پرتگیزوں اور ولندیزوں کی رقابت ۳۸۔ امبوے نا کا قتل۔

دربار مغلیہ میں سفارتیں ۳۹ - ابتدائی کارخانے ۴۰ - انگریز سوداگروں کا باہمی تنازعہ
ملک گیری کے منصوبے اور ناکامیاں ۴۱ - نئی کمپنی اور اس کا اتحاد ۴۲ :-

۳ - انگریزوں کا غلبہ فرانسیسیوں پر :-

فرانسیسیوں کی آمد ہند میں ۴۵ - پانڈی چیری کی بنا ۴۵ - فرانسیسی مداخلت ملکی معاملات میں ۴۶ - دوپلے ۴۷ - انگریزوں سے پہلی جنگ ۴۸ - جنگ میلاپور کی مفروضہ اہمیت ۴۹ - دوسری جنگ ۵۰ - محمد علی کی کامیابی ۵۱ - آخری جنگ اور شکست ۵۲ :-

باب سوم : ابتدائی مقبوضات اور لڑائیاں - ۵۴ تا ۸۵

۱ - دیوانی بنگالہ :-

بلیک ہول کا قصہ ۵۵ - جنگ پلاسی ۵۸ - میر جعفر کی نوابی ۵۹ - میر قاسم سے مخالفت ۶۰ - جنگ بنگالہ - حصول دیوانی ۶۳ :-

۲ - وارن ہیسٹنگز کا زمانہ :-

قحط ۱۷۷۰ء ۶۴ - وارن ہیسٹنگز ۶۵ - تنظیم حکومت کی ابتدا ۶۷ - اس عہد کی لڑائیاں :-
(۱) جنگ روہیلہ - (۲) پہلی جنگ مرہٹہ ۶۸ - عہد نامہ وڑگاؤں ۷۰ - مشہور معرکے اور صلح ۷۱ - عہد نامہ سالبائی ۷۲ - (۳) محاربات میسور ۷۲ - اہم واقعات ۷۳ - میسور کی دوسری جنگ ۷۴ - صلح نامہ منگلور ۷۷ :-

۳ : کارنوالس اور جان شور :-

ہیسٹنگز کا استعفیٰ ۷۸ - قانون ہندوستان مجریہ ۱۷۸۴ء ۷۹ - لارڈ کارنوالس ۸۰ - تیسری جنگ میسور ۸۱ - عہد نامہ سری رنگ پٹن ۸۲ - ملکی اصلاحات ۸۳ - سرجان شور ۸۴ :-

۱۴۸

باب چہارم : سیادت ہند کا منصوبہ ۸۶ تا ۱۱۵

۱ - ولزلی کے ارادے اور کارنامے :-

نیا گورنر جنرل ۸۶ - معاملات دکن ۸۷ - فرانسیسیوں کا حصہ معاملات ہند میں ۸۷ - میسور کی آزادی کا خاتمہ ۸۹ - مزید مقبوضات (الحاق) ۹۰ - مرہٹوں کے معاملات ۹۱ - دوسری جنگ مرہٹہ ۹۳ -

کمپنی کا خسارہ اور بھونسلا پر ۹۴۔ ہلکر سے لڑائیاں ۹۵۔ جنگ ڈیگ و بھرتپور ۹۷۔ صلح ۹۸ تک

۲۔ جنگ و فتوحات جنگ میں وقفہ:۔

ولزلی کی علیحدگی ۹۸۔ مصالحانہ طرز عمل ۹۹۔ ویلور کا فساد ۱۰۰۔ لارڈ منٹو ۱۰۱۔ ممالک غیر سے معاملت تجارتی اجارے کی تنسیخ ۱۰۲ تک

۳۔ منصوبۂ سیادت کی تکمیل:۔

مارکوئیس آف ہیسٹنگز ۱۰۲۔ جنگ نیپال ۱۰۳۔ کالنگا کے معرکے ۱۰۴۔ پنڈاروں کا استیصال ۱۰۸ مقاصد و تدابیر ۱۰۹۔ آخری جنگ مرہٹہ ۱۱۱۔ اہم نتائج ۱۱۲۔ قبضہ سنگاپور، مختلف واقعات ۱۱۳ تک

باب پنجم: مزید مقبوضات اور آغاز بادشاہی ۱۱۶ تا ۱۵۳

۱۔ بعض اندرونی اصلاحات اور بیرونی لڑائیاں:۔

پہلی جنگ برما ۱۱۶۔ لارڈ ولیم بنٹنک ۱۱۷۔ نئے مقبوضات ۱۱۸۔ ستی اور ٹھگی کا انسداد ۱۱۹۔ فرمان شاہی کی تجدید ۱۲۰۔ انگریزی تعلیم کا آغاز ۱۲۱۔ اوک لینڈ۔ معاملات افغانستان ۱۲۲۔ جنگ افغانستان ۱۲۳۔ انگریزی فوج کی تباہی ۱۲۶۔ تلافی کی تدابیر ۱۲۸۔ الحاق سندھ ۱۲۹۔ الن برو کی بازطلبی ۱۳۰ تک

۲۔ جنگ ہائے پنجاب اور نئے مقبوضات:۔

لارڈ ہارڈنگ (اول)۔ جنگ پنجاب ۱۳۱۔ دوسری جنگ کے اسباب ۱۳۳۔ چلیان والہ اور گجرات کے معرکے ۱۳۴۔ الحاق پنجاب ۱۳۶۔ برما کی دوسری جنگ ۱۳۶۔ مختلف علاقوں کی ضبطی ۱۳۷۔ الحاق ستارا و ناگپور وغیرہ ۱۳۸۔ الحاق برار و اودھ ۱۳۸۔ نئے انتظامات ۱۴۰ تک

۳۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور کمپنی کی حکومت کا خاتمہ:۔

شورش کے اسباب۔ (۱) ہندوستانی فوج میں ۱۴۱۔ (۲) عام رعایا میں ۱۴۲۔ طبقۂ امرا ۱۴۳۔ طبقۂ متوسط و عوام ۱۴۴۔ مذہبی تعصبات ۱۴۴۔ آغاز فساد:۔ (۱) میرٹھ میں ۱۴۵۔ (۲) دیگر مقامات میں ۱۴۶۔ مالوہ اور بندھیل کھنڈ ۱۴۸۔ عام رعایا کا حصہ ۱۴۹۔ نتائج ۱۵۰۔ اعلان شاہی ۱۵۲ تک

باب ششم - عہد شاہان برطانیہ - ۱۵۴ تا ۱۸۶

۱ - اہم تاریخی واقعات :-

کیننگ کے نئے انتظامات ۱۵۴ - نیل کا جھگڑا ۱۵۵ - لارڈ الگن (اوّل) سرجان لارنس ۱۵۶
۱۵۶ - لارڈ میئو ۱۵۷ - دربار قیصری اور قحط ۱۸۷۶ء ۱۵۸ - جنگ افغانستان ۱۵۸ - رپن
کی ہردلعزیزی ۱۶۳ - نیشنل کانگرس کی تاسیس ۱۶۴ - لارڈ ڈفرن ۱۶۵ - الحاق برما ۱۶۵
سرحدی لڑائیاں ۱۶۶ - لارڈ کرزن کی غیر ہردلعزیزی ۱۶۹ - مہم تبت تقسیم بنگال وغیرہ ۱۷۰
آثار قدیمہ اور شاہی دربار ۱۷۱ - لارڈ منٹو، ہارڈنگ، چیمسفورڈ ۱۷۲ تا

۲ - جدید تعلیم و تمدن :-

انگریزی تعلیم کی ابتدا ۱۷۴ - وڈ کا تعلیمی مراسلہ - بعد کی تاریخ ۱۷۶ - مطابع اور السنۂ ہند ۱۷۸
انقلاب تمدن کے دیگر اسباب ۱۸۰ - افکار و اخلاق ۱۸۱ تا

۳ - آئین و اصول حکومت :-

انگریزی فتح کی نوعیت ۱۸۳ - ابتدائی مجالس وضع قوانین ۱۸۴ - حکومت ہند کی
محکومانہ حیثیت ۱۸۴ - اہل ہند کے مطالبات اور نئی اصلاحات ۱۸۵ تا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ ہند

کتاب چہارم

باب اول

نئی طاقتیں

۱۔ مرہٹوں کا فروغ

میدان کرنال و پانی پت کی پہلی لڑائیاں ہندوستان میں کسی نئے خاندان کی بہتر و قوی تر بادشاہی کا افتتاح کرتی ہیں لیکن یہ آخری لڑائی اہل ہند کی مرکزی سلطنت کا ایسا خاتمہ ثابت ہوئی جس کے بعد پھر اہل ہند خود تمام ممالک ہند میں کوئی متحد اور مرکزی حکومت نہ قائم کر سکے اور خود احمد شاہ ابدالی کے دل میں اگر اس قسم کا ارادہ تھا بھی تو اس کے ہموطن سپاہیوں نے رفاقت نہ کی اور اسے مجبوراً صوبۂ پنجاب پر اکتفا اور دہلی سے دو تین ہی مہینے میں مراجعت کرنی پڑی۔ شاہ جہاں کے اس ویران شدہ دار السلطنت میں شہزادۂ عالی گہر پسر عالمگیر ثانی کی بادشاہی کا اعلان کرا دیا گیا تھا جو باپ کے مرنے کے بعد (شاہ عالم ثانی کے لقب سے) صوبۂ بہار کے ایک مقام پر پٹنہ میں تخت نشین ہوا (جمادی الثانی ۱۱۷۴ھ ۱۷۶۱ء) لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض رسم قدیم کو پورا کرنا تھا ورنہ بہار و بنگال میں شاہ عالم کی پیہم ناکامیوں نے اس بات کا بھی امکان باقی نہ رکھا تھا کہ وہ کم سے کم شمالی ہند ہی کا فرماں روا ہو جائے گا۔

سلطنت ہندوستان کے تازہ ترین آرزو مند، سداشیو (بھاؤ) کا وہ سر ہی نہ رہا جس میں سلطنت کی آرزو تھی۔ پانی پت کے "مقتل" میں اس کی لاش بے سر کی ملی اور بہت دن تک شبہ رہا کہ یہ لاش اسی کی تھی یا کسی اور کی۔

شمالی یا جنوبی ہند کی کسی طاقت میں نہ یہ قابلیت تھی نہ ہوس کہ سلاطین تیموریہ کی جگہ لینے کا

تہیہ کرتی۔ غرض نئے نئے خود سر گروہ پیدا ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ممالک ہند کا سیاسی شیرازہ پھر بکھر گیا اور دستور کے مطابق جابجا نئی ریاستیں یا قومیں خود مختار بن گئیں اور تقریباً نصف صدی تک سارے ملک میں اسی طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ ان ریاستوں کے مفصل حالات لکھنے کا یہ محل نہیں ہے اور جہاں تک ممکن ہو ہم ممالک ہند کی مجموعی حالت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، بایں ہمہ اس باب میں اس قسم کی بعض نوخیز اور بڑی ریاستوں کا علیحدہ علیحدہ اجمالاً ذکر کرنا پڑے گا تاکہ انگریزی تاجروں کی آمد اور آئندہ تمام ممالک ہند پر تسلط پانے کے واقعات سمجھنے میں آسانی ہو۔

مرہٹوں کی ریاست

بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں دکن کی مرہٹہ قوم کو جو سیاسی قوت حاصل ہوئی اس کا بانی عام طور پر سیواجی کو سمجھا جاتا ہے لیکن تاریخی لحاظ سے وہ مرہٹوں کی قومی تاریخ کے سلسلے میں ایک بیچ کی کڑی ہے ورنہ اس قوم کو سب سے پہلے ملک عنبر حبشی نے، یا کہنا چاہئے کہ احمد نگر و بیجاپور کی جنگی ضرورتوں نے، سپہ گری سکھائی اور خود مرہٹوں میں ساہوجی (بھونسلہ) پہلا شخص ہے جس نے اس تعلیم سے فائدہ اٹھا کر اپنے ہم قوم سپاہیوں کو ایک ممتاز فوجی جمعیت میں منتظم کیا اور اپنے واسطے تاریخ ہندوستان میں جگہ نکال لی۔ بے شبہ سیواجی کی یورش و دلیری نے دور دور کے مرہٹوں میں جنگی جذبات پیدا کر دیئے اور ان میں قومی اتحاد کی روح پھونک دی، جو اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن خود اس کا طرز عمل کسی باقاعدہ اور مستقل حکومت کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا اور قرائن کہتے ہیں کہ راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں کی تادیبی مہم (۱۰۷۵ھ) نے اس بات کا خود سیواجی کو یقین دلا دیا تھا چنانچہ آئندہ اس کی قزاقانہ تاخت و تاراج میں فی الجملہ کمی ہو گئی اور وہ اپنے علاقے میں ایک باقاعدہ ریاست قائم کرنے پر متوجہ ہو گیا، لیکن یہ ریاست بھی کوئی خاص قوت و پائداری حاصل کرنے نہ پائی تھی کہ سنبھاجی کی شوریدہ سری نے مغلوں کے ہاتھ سے اس کا خاتمہ کرا دیا اور مغل بادشاہ (اورنگ زیب) کے طویل قیام دکن اور کارگر انتظامات نے مرہٹوں کی نیم آزادانہ حیثیت بھی باقی نہ رہنے دی۔

سنبھاجی کے فرزند ساہوجی نے اورنگ زیب کے لشکر میں پرورش پائی اور گو اس کی حیثیت ایک شاہی قیدی کی سی تھی بایں ہمہ مغل بادشاہ کی مہر و عنایت کی بہت سی روایتیں فارسی اور نیز مرہٹی تحریروں میں محفوظ ہیں کہ وہ ساہو کے ساتھ اپنے خاندانی لڑکوں کا سا برتاؤ کرتا تھا، اور غالباً یہی ایک وجہ تھی کہ جب اسے باج گزاری کی شرط پر مغلوں نے رہائی دی تو وہ خود اس شرط کی خلاف ورزی کرنی نہ چاہتا تھا لیکن آئندہ ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ مرہٹوں کی حکومت اول اول

بالقوۃ اور آخرکار علانیہ ہندوستان کی ایک خودمختار و قوی سلطنت بن گئی ہو

پیشوا کا اقتدار

یہ اہم تغیر یعنی پہلے جبراً و بے قاعدہ اور پھر باقاعدہ حکومت و بادشاہی کرنے کا شعور مرہٹوں میں بہت کچھ [illegible] ساہوجی کے اُن برہمن وزیروں کی محنت و ذہانت کا نتیجہ تھا جو "پیشوا" کے لقب سے مشہور ہیں۔ ابتدا میں یہ عہدہ دار دوسرے درجے کا وزیر سمجھا جاتا تھا لیکن جب بالاجی (وشوناتھ) پیشوا مقرر ہوا (سنہ ۱۷۲۰ء) تو اس کے ذاتی رسوخ سے رفتہ رفتہ یہ منصب سب سے اعلیٰ اور آخر میں موروثی اور اصلی حاکم کے مُرادف ہوگیا۔ بالاجی نے راجہ ساہو کے بہت سے اندرونی جھگڑے رفع کیئے اور اسی ضمن میں امیرالامرا سید حسین علی خاں سے چوتھ اور سردیس مکھی کے متعلق وہ سند حاصل کی جس کا پچھلے حصّے میں ذکر آچکا ہے۔ اس سند کی تصدیق محمد شاہ کے عہد میں ہوئی (۱۷۳۲ء) اور اس نے اوّل تو ساہو کو تاراباؔئی اور اس کے فریق کے مقابلے میں مرہٹوں کا مسلّمہ سردار و رئیس بنا دیا اور دوسرے وصول مالگزاری کی غرض سے بالاجی کو ایک وسیع محکمہ قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کے ماتحت عمّال ممالکِ دکن کے قریب قریب ہر ضلع میں نظر آنے لگے اور اس واقعے نے نہ صرف مرہٹہ حکومت کی وقعت بلکہ مرہٹوں میں خود پیشوا کا اعزاز و اقتدار بڑھا دیا ہو

بالاجی کے بعد اس کا بیٹا باجی راؤ پیشوا ہوا (۱۷۲۰ء تا ۱۷۴۰ء) وہ اپنے باپ سے کہیں زیادہ بلند حوصلہ اور جنگجو سردار گزرا ہے اور اگر (سیواجی کے بعد) اسے مرہٹہ قوم کا سب سے بڑا شخص کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہ اپنی فراست سے یہ بات بخوبی سمجھ گیا تھا کہ سلطنت مغلیہ کی جڑ میں گھن لگ چکا ہے اور ایک عالمگیر اصول کے مطابق کسی نئی قوم کے اُبھرنے کا ٹھیک وقت وہی ہے جب کہ کوئی دوسری قوم حالت زوال میں ہو اور نئے لوگ کمال مستعدی کے ساتھ اس کی گرتی دیوار سے اپنی عمارت کے لیئے سنگ و خشت جمع کرلیں۔ یہاں دوبارہ یہ وضاحت کردینی مناسب ہوگی کہ آج جب کہ سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہوئے مدّت گزرچکی ہے اُس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں معلوم ہوتا کہ محمد شاہ کے عہد ہی سے اس سلطنت میں زوال پیدا ہوگیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ خود محمد شاہ کے معاصرین بھی اس بات کا یقین رکھتے تھے، یا یہ کہ وہ سلطنت کی روزافزوں خرابی کو اُسی وقت سے ناقابلِ اصلاح سمجھنے لگے تھے، اس کے برعکس جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں، محمد شاہ کی زندگی تک ہندوستان کے ذی اثر لوگوں پر مغل بادشاہ کا بہت کافی رعب رہا اور مرہٹوں کی قوم کو اس کی زندگی میں علانیہ خودمختاری کا دعویٰ کرنے کی ہمت نہ ہوئی البتہ یہ پہلی قوم تھی جو پیشوا کی سرکردگی میں مرکزی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیئے

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں گھس پڑی اور جہاں گنجائش ملی، قابض ہو گئی ہو

گجرات و مالوہ میں نفوذ

گجرات اور مالوے کے صوبہ داروں نے مرکزی حکومت سے اختلاف اور اپنے ذاتی رقیبوں سے جھگڑوں کی وجہ سے مرہٹوں کو امداد کے واسطے خود طلب کیا اور وہاں بھی چوتھ وصول کرنے کا حق انھیں دے دیا تھا لیکن اول تو حکومت دہلی نے ان کے اس حق کو باضابطہ تسلیم نہیں کیا دوسرے نواب نظام الملک آصفجاہ کے خوف سے وہ بہت دن تک اس "حق" سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے تاآنکہ نواب آصفجاہ نے اس خیال سے کہ کہیں بالاجی شہنشاہ دہلی سے حکومت دکن کی کوئی سند نہ حاصل کر لے بالاجی سے مصالحت کر لی جو ایک طور پر مرہٹوں کیلئے اجازت ہو گئی کہ وہ صوبہ شمال میں تاخت و تاراج کریں ہو[1]

ان صوبوں میں چوتھ وصول کرنے کے واسطے حسب دستور باجی راؤ نے چند مرہٹہ سردار مقرر کئے تھے اور انہی کے خاندان گائیکواڑ، سندھیا اور ہلکر کے نام سے اب تک گجرات و مالوہ کے اقطاع پر حکمراں ہیں، مرہٹوں کا چوتھا مشہور خاندان بھونسلہ پہلے سے برار میں راجہ ساہو کی نیابت کرتا تھا باجی راؤ کی اس خاندان کے سردار رگھوجی بھونسلہ سے مخالفت تھی اور اس نے پیشوا کو دو ایک مرتبہ سخت زک بھی دی ہو

آئندہ چند سال تک باجی راؤ کچھ اندرونی جھگڑوں میں اور کچھ دربار دہلی سے خط کتابت میں معروف رہا کہ گجرات و مالوہ میں چوتھ وصول کرنے کی باقاعدہ سند حاصل کرے، اس میں بلا وقت کامیابی کی امید اس لئے تھی کہ ان دنوں خان دوراں خاں اور ایرانی امرا کا دربار محمد شاہ میں بہت رسوخ ہو گیا تھا اور یہ لوگ تورانی امیروں کی رقابت میں چاہتے تھے کہ ممکن ہو تو مرہٹوں سے مصالحت کر کے انھیں نواب آصفجاہ سے لڑا دیں جو تورانیوں کا مسلمہ سرگروہ تھا اور ناعاقبت اندیش خان دوراں خاں (وزیر جنگ) کا محسود، چنانچہ دہلی کے یہ امرا دکن کے صوبوں میں بادشاہ کی طرف سے مرہٹوں کو ایک عشر کے بجائے یک خمس ("سردیش پانڈی گری") کا حق نیز راجپوتانے کی ریاستوں سے چوتھ وصول کرنے کی اجازت دینے پر آمادہ ہو گئے لیکن باجی راؤ کا اصلی مطالبہ گجرات اور مالوہ کے متعلق تھا اور نواب آصفجاہ کو حکومت دہلی کا مخالف سمجھکر وہ بادشاہ کی فوجی قوت کو بہت حقیر سمجھنے لگا تھا، لہذا اس نے

---

[1] گرانٹ ڈف کا بیان ہے کہ اس کے متعلق نواب نظام الملک اور پیشوا کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا تھا (جلد اول صفحہ ۴۲۱) لیکن مولف نے اس کی مفصل شرائط تحریر نہیں کیں نہ اپنے ماخذ کا حوالہ دیا ہو

اپنے مطالبات میں کوئی کمی نہیں کی اور یہ سن کر کہ دہلی میں بھی مقابلے کی جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں وہ بندیل کھنڈ سے آگرے کی طرف بڑھا اور ایک فوج کو اس نے جمنا کے پار بھیجا کہ دوآب کا علاقہ تاراج کرے اس فوج کو برہان الملک سعادت خاں صوبہ دار اودھ نے سخت شکست دی اور ادھر مرہٹوں کی اصلی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیئے وزیر الممالک قمر الدین خاں اور خان دوراں خاں آگرے کے آگے تک بڑھ آئے (۱۷۳۷ء ۱۱۴۹ھ) باجی راؤ نے مقابلے سے پہلو تہی کی اور پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں سے چکر کھا کر یک بہ یک پائے تخت دہلی کے قریب آنکلا۔ خاص شہر پر اسے پھر بھی حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور حوالی میں صرف کچھ ہندو اس کی غارت گری کا شکار ہوئے جو شہر کے باہر کالکا کے مندر میں تہوار منانے اور پوجا کرنے آئے تھے[5] پھر بادشاہی فوجوں کا اپنے تعاقب میں آنا سن کر وہ بہ عجلت میوات کے راستوں سے دکن واپس ہو گیا (سنہ ۱۱۵۰ھ) اور اس ناکامی نے غالباً اسے یقین دلا دیا کہ گو حکومت دہلی میں اپنے بعید صوبوں کا انتظام درست رکھنے کی صلاحیت باقی نہیں ہے تاہم مغل بادشاہ کی فوجی قوت پر خاص اس کے مرکز میں حملہ کرنا جوکھوں سے خالی نہیں چنانچہ آئندہ نادر شاہ کے حملے اور اہل دہلی کی سخت پریشاں حالی کے باوجود باجی راؤ نے چنبل سے ادھر کوئی حملہ نہیں کیا۔ اس کی باقی زندگی جنوبی ہند اور مالوے کی لڑائیوں میں صرف ہوئی اور ہر چند اپنی وفات کے وقت (۱۷۴۰ء ۱۱۵۳ھ) وہ بہت سی مشکلات اور پریشانیوں میں گرفتار ہو گیا تھا، لیکن سچ یہ ہے کہ مرہٹوں کو صحیح معنی میں حکومت و سلطنت کے راستے پر اسی نے ڈالا اور اسی کی اولو العزمی کی بدولت وہ قزاقوں کے بے ترتیب گروہ کے بجائے ہندوستان کی سب سے ترقی پذیر قوم بن گئے اسی کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے کہ مرہٹوں کے اصلی رئیس کا پیشوا کے سامنے محض برائے نام راجہ رہ جانا، ایسی اندرونی خرابی تھی جس نے ان کی قوم کی مجموعی قوت کو زیادہ عرصے تک مستقل اور متحد نہ رہنے دیا، ان کے مختلف سردار جس قدر زیادہ طاقتور ہوتے گئے اسی قدر اپنی صدر حکومت کے قابو سے باہر ہوتے گئے، اور حق یہ ہے کہ اس خرابی کے ذمہ دار ایک حد تک یہی برہمن پیشوا تھے جنھوں نے حکومت کے اصلی وارث کو رفتہ رفتہ عضو معطل کر دیا تھا۔

بہر حال، اب نہ صرف پیشوا بلکہ خود مرہٹہ قوم کے آئندہ اقتدار و ترقی کا انحصار اس پر تھا کہ جہاں تک ممکن ہو مرہٹہ سرداروں کی اندرونی تفریق پر ظاہری اتحاد و مصالحت کا پردہ پڑا رہے

[5] گرانٹ ڈف جلد اول صفحہ ۱۴۴ بحوالۂ مراسلہ باجی راؤ لو

اور اس کی تدبیر یہی تھی کہ وہ بیرونی یا غیر طاقتوں سے جنگ و جدال میں مصروف رہیں، برار کا مرہٹہ حاکم رگھوجی بھونسلہ تو باجی راؤ کے بعد بھی پیشوا کی حکومت سے آزاد ہی رہا بلکہ اس کی جنگی قوت بڑھتی گئی اور چند حملوں کے بعد وہ بطور خود گونڈوانے اور اڑیسے کے اکثر اضلاع پر قابض ہو گیا، لیکن اکثر مرہٹہ سردار بیرونی لڑائیوں میں تیسرے پیشوا بالاجی یا اس کے سپہ سالار سداشیو بھاؤ کے ساتھ رہے اور اسی کے زمانے میں صوبۂ مالوہ کی چوتھ کی سند شاہی بھی مرہٹوں کو حاصل ہو گئی (سنہ ۱۱۵۵ھ) جس کے واسطے باجی راؤ بہت روز تک جد و جہد کرتا رہا تھا۔

مرہٹوں کا دخل شمالی ہند میں

یہ سند محمد شاہ نے بالاجی کو اس خدمت کے صلے میں دی تھی کہ اس نے بنگالے پر رگھوجی بھونسلہ کی یورش روکنے میں بادشاہی صوبہ دار میرزا محمد علی وردی خاں کو فوجی مدد دی اور خود اپنے ہمقوموں سے لڑ کر انھیں بنگالے سے خارج کر دیا، لیکن اس واقعے سے جہاں مرہٹوں کا اندرونی نفاق ظاہر ہوتا ہے اسی کے ساتھ دہلی کی صدر حکومت کی کمزوری بھی آشکارا ہے کہ وہ اپنے بعید صوبوں کو بچانے کے واسطے مرہٹوں کی دست نگر ہو گئی تھی، اور جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں محمد شاہ کے انتقال کے بعد تو خاص پایۂ تخت کے تنازعات میں وہ مدد کے واسطے طلب کیے جاتے تھے اور دکن میں انھی دنوں ایسے واقعات پیش آئے جن سے پیشوا کو مزید قوت اور شمالی ہند کے معاملات میں دخل دینے کی فرصت حاصل ہو گئی۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ اوّل تو ۱۱۶۱ھ میں نواب نظام الملک آصف جاہ اوّل نے انتقال کیا اور نواب ناصر جنگ کی مسند نشینی کے ساتھ ہی کرناٹک میں وہ لڑائیاں چھڑ گئیں جن کی وجہ سے دکن کی یہ اسلامی طاقت عرصے تک اندرونی خلفشار میں مبتلا رہی اور مرہٹوں کو اس خطرناک ہمسائے کی طرف سے کوئی خاص اندیشہ نہ رہا، دوسرے ۱۱۶۲ھ میں راجہ ساہو نے لاولد وفات پائی اور ہر چند پہلے اس کی بیوہ اور بعد میں تارا بائی نے بہت کچھ کوشش و سازش کی کہ اس موقع پر پیشوا کا زور توڑ دیا جائے لیکن اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی اور آخرکار بالاجی اپنے سب حریفوں پر غالب آ گیا اور اس نے تارا بائی کے پوتے رام راجا کو ساہو کا جانشین اور مرہٹہ حکومت کا برائے نام راجہ تسلیم کرا دیا پھر اس نے رگھوجی بھونسلہ کو بھی مصالحت سے اور داماجی گائیکوار کو شکست دے کر آخر میں اپنا ساتھی بنا لیا تھا اور اسی اندرونی انتظام کے بعد اب مرہٹے تازہ قوت کے ساتھ مالوے اور راجپوتانے کے علاقوں میں چوتھ وصول کر رہے تھے (سنہ ۱۱۶۰ھ)۔

جنگ پانی پت اور اس کے نتائج

یہی زمانہ ہے جب کہ مرہٹوں کی روزافزوں طاقت سے غازی الدین ثالث عماد الملک کو فائدہ اٹھانے کا خیال آیا اور اس نے عالمگیر ثانی اور اس کے امیر الامرا نجیب الدولہ کے مقابلے میں مرہٹوں کو اپنی مدد کے واسطے طلب کیا اور اسی سلسلے میں وہ آدینہ بیگ خاں کی مدد کے نام سے پنجاب میں پہنچ گئے جس کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے یہ مرہٹوں کے انتہائی عروج کا وقت تھا اور بے شبہ اگر پنجاب پر قبضہ کر کے وہ احمد شاہ ابدالی سے جنگ مول نہ لیتے تو غالباً شمالی ہند کے دوسرے علاقوں پر بہت جلد اُن کا اثر قائم ہو جاتا، اسی طرح دکن میں ایک ہی معرکے نے اُن کو چیرہ دست کر دیا تھا (جنگ اودگیر ۱۷۶۰ء ۱۱۷۳ھ) اور نواب صلابت جنگ کو مجبور ہو کر نہ صرف خاندیس بلکہ دولت آباد و بیجاپور کے اقطاع بھی پیشوا کے حوالے کرنے پڑے تھے جو صوبہ دار دکن کی انتہائی کمزوری کی دلیل تھی۔ اگر ان کامیابیوں نے مرہٹہ سرداروں کے دل میں غرور و خود نمائی کے جذبات پیدا کر دیئے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی ملکی مقبوضات کے ساتھ ان کے ہاں بادشاہی کے لوازم اور ساز و سامان میں بھی نمایاں اضافہ ہو رہا تھا۔ بے قاعدہ جرگوں اور رہزن گروہوں کے بجائے اب پیشوا کے تحت میں ایک باقاعدہ اور تنخواہ دار فوج تھی جس میں ابراہیم خاں گاردی کے وہ دس ہزار پیادے خاص طور پر مشہور تھے جنہیں فرانسیسیوں کے طرز پر قواعد جنگ سکھائے گئے تھے اور جو اسی زمانے میں نواب صلابت جنگ کی ملازمت چھوڑ کر حکومت پونا[۱] کے نوکر ہو گئے تھے اسی طرح پیشوا کے توپخانے میں اب اتنی توپیں تھیں کہ ہندوستان کی اور کسی طاقت کے پاس نہ ہوں گی؛

بایں ہمہ جب اس جنگی قوت اور ساز و سامان کی سب سے بڑی آزمائش کا وقت آیا تو مرہٹوں کی نااہلی یا کہنا چاہیئے کہ اُس زمانے کے اہل ہند کی نااہلی کا راز فاش ہو گیا کہ نہ ان میں جانباز و مستقل مزاج سپاہی تھے نہ ایسے کارداں سپہ سالار جو ایک دلیر و ہوشیار دشمن سے لڑ کر فتح حاصل کر لیتے۔ کم تعداد اور کم سامان افغانی حریفوں سے پانی پت کے میدان میں جو شکست انہوں نے کھائی وہ کئی اعتبار سے تاریخ میں اہل ہند کی سب سے بڑی شکست ہے جب رفتہ رفتہ اس کی تفصیلی خبریں دکن میں پہنچیں تو مرہٹی علاقوں میں بمشکل کوئی گاؤں ایسا ہو گا جہاں پانی پت کے مقتولین کا ماتم بپا نہ ہو گیا ہو، خود پیشوا کی نسبت عام خیال ہے کہ اسی قومی مصیبت اور

[۱] مرہٹوں کا برائے نام راجہ ستارا کے محلات ہی میں نظر بند رہا لیکن ۱۱۶۳ھ ۱۷۵۰ء سے پیشوا کا مستقر یعنی اصلی دارالحکومت پونا بن گیا تھا؛

جوان بیٹے وسواس راؤ کے غم نے جو اس لڑائی میں مارا گیا تھا اس کی جان لی اور وہ جنگ پانی پت کے چند مہینے بعد مرگیا (۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء) نیز یہی شکست تھی جس نے مرہٹوں کے سیلاب کو عین طغیانی کے وقت شمالی ہند میں بڑھنے سے روک دیا اور کم سے کم چند سال کے واسطے چنبل کے شمال میں ان کی حکومت کا نشان باقی نہ رہا ہو

لیکن اس شدید نقصان و ذلت کے باوجود یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پانی پت کی اس لڑائی نے مرہٹوں کی قوت بالکل توڑ دی۔ اس کے برخلاف ہم انھیں آئندہ تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کی ریاستوں میں سب سے طاقتور پاتے ہیں، اپنے ملکی حریفوں سے اُن کے دبنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی کیونکہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں سے نہیں بلکہ ایک بیرونی دشمن سے شکست کھائی تھی جو فتح حاصل کرنے کے بعد ہندوستان سے واپس چلا گیا، اور پانچ سات برس کے بعد ہی مرہٹہ سوار چنبل اتر کے پھر بھرتپور و آگرے کی نواح میں نظر آنے لگے اور جب مغل بادشاہ شاہ عالم (ثانی) مشرقی صوبوں سے مایوس و ناکام اپنے پائے تخت میں واپس آیا (۱۱۸۵ھ) تو روہیلکھنڈ اور شمال مشرقی راجپوتانے کے سرکشوں کو زیر کرنے میں اُسے مرہٹوں ہی سے مدد ملی جن کو رفتہ رفتہ دربار دہلی میں دوبارہ رسوخ حاصل ہوگیا اور آخر میں سندھیا کے ذریعے پیشوا کو تمام ہندوستان میں بادشاہ کی نیابت کی سند حاصل ہوگئی (۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء)

مگر ظاہر ہے کہ یہ سند یا فرمان شاہی عملاً کچھ زیادہ وقیع نہ تھا۔ بے شبہ ہندوستان میں مغل بادشاہ کا ابھی تک سب لوگ ادب و احترام کرتے تھے اُس کے اجداد نے اہل ہند میں سیاسی اتحاد کا جو احساس پیدا کر دیا تھا اس کا فطرتی مقتضیٰ تھا کہ ان کی آنکھیں تمام ممالک ہند کا کوئی مرکز واحد تلاش کریں اور یہ مرکز اگر کہیں نظر آتا تھا تو وہ اسی مغل بادشاہ کی ذات تھی[۱] لیکن سیاسی دنیا میں عمدہ جذبات اور محض رسمی اطاعت سے کوئی حکومت نہیں چلتی، شاہ عالم کی براہ راست حکومت صرف مغربی دوآب، روہیلکھنڈ، شمالی مشرقی راجپوتانہ۔ غرض دلی سے تقریباً دو دو سو میل کے فاصلے تک محدود تھی۔ اور اس میں بھی روہیلے اور جاٹ جا بجا بغاوت و سرکشی کرتے رہتے تھے۔ ستلج کے اوپر پنجاب کا صوبہ پہلے ہی افغانوں کے تحت میں آگیا تھا اور جب ان سے چھٹا تو وہاں

[۱] سندھیا کا مشہور جرنیل ڈی بوئنی شہادت دیتا ہے کہ اگرچہ تمام جنوبی ہند شاہ عالم کی حکومت سے آزاد ہوچکا تھا لیکن ہنوز اس کا اتنا اثر باقی تھا کہ ہندوستان بھر میں کسی رئیس و راجہ کو علانیہ "بادشاہ" کا لقب اختیار کرنے کی جرأت نہ تھی۔ (" مادھو جی سندھیا" مولفہ کین صفحہ ۷۵)

سکھوں کی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ مشرقی دوآب میں والیِ اودھ کی حکومت تھی اور اس کا بادشاہ سے بس اتنا ہی تعلق رہ گیا تھا کہ اب تک اس کا سرکاری لقب "نواب وزیر" تھا ورنہ حکومت کے اندرونی انتظام میں اس کو بالکل آزاد سمجھنا چاہیئے۔ باقی جنوب میں مدت سے مغل بادشاہ کی سرحد دریائے چنبل بن گیا تھا جس کے آگے مرہٹوں یا مقامی رئیسوں کا راج تھا۔

مرہٹہ قوت کا زوال

الغرض، ایسے بادشاہ سے اگر نیابت کی سند ملی بھی تو وہ کچھ بہت مفید مطلب نہ ہو سکتی تھی، دوسرے یہ سند جو پیشوا کے نام پر حاصل کی گئی تھی اس سے جو کچھ نفع ممکن تھا وہ خود مادھوجی سندھیا اٹھانا چاہتا تھا، اور گو دربارِ دہلی میں وہ اپنے آپ کو پیشوا کا ماتحت و قائمقام ظاہر کرتا تھا مگر درحقیقت حکومت پونا سے اس کا یہ تعلق محض سیاسی اور ذاتی اغراض پر مبنی تھا ورنہ بجائے خود اس کے مختارِ کامل ہونے میں کوئی کسر نہ رہی تھی، شمالی مالوے اور نواحِ دہلی میں جو مرہٹہ عامل اور مرہٹہ فوجی دستے متعین تھے وہ بھی براہِ راست سندھیا ہی کے ملازم تھے اور حکومت پونا کو ان کے معاملات میں کوئی دخل نہ تھا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ گدی کے اصلی وارث کو بیکار بنا کے برہمنوں کا حکومت پر قابض ہو جانا، مرہٹہ ریاست کی بنیادی کمزوری تھی اور دوسرے پیشوا ہی کے زمانے میں اس کے بُرے نتائج کا ظہور ہونے لگا تھا، لیکن بالاجی پیشوا کی وفات کے بعد جب اُس کے بھائی رگھوناتھ راؤ یا رگھوبا نے حکومت پر خود قبضہ جمانا چاہا اور اس میں اور بالاجی کے بیٹوں میں کشاکش ہوئی تو پیشوا کے رہے سہے اقتدار میں بھی کمی آنے لگی اور چوتھے پیشوا کے بعد یہی خانگی نزاع سخت نقصان رساں بن گئی اور مرہٹوں کے مختلف طاقتور سردار پونا کی مرکزی حکومت سے قریب قریب آزاد ہو گئے، اس طرح سچ پوچھیے تو مادھو راؤ (چوتھے پیشوا) کے مرتے ہی (۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء) مرہٹہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تھا[۱] اور گو ابھی تک

---

[۱] اس جگہ پیشواؤں کا شجرۂ نسب پیشِ نظر رکھنا مفید ہوگا:—

(۱) بالاجی وشوناتھ

(۲) باجی راؤ (۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء تا ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء)

(۳) بالاجی راؤ (تا ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء)

وسواس راؤ — (۴) مادھو راؤ (تا ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء) — (۵) نرائن راؤ (تا ۱۱۸۷ھ)

(۶) رگھوناتھ راؤ (رگھوبا) تا ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء

(۷) مادھو راؤ نرائن (۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء) — (۸) باجی راؤ (معزولی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء)

حکومت پونا کی بیرونی لڑائیوں میں دوسرے مرہٹہ سردار بھی شریک و مددگار ہوجاتے تھے لیکن اول تو اس امداد میں اگر خود غرضی نہیں تو خود مختاری کی شان ضرور تھی دوسرے خود مرکزی حکومت میں یہ قوت و قابلیت نہ رہی تھی کہ وہ صحیح معنوں میں تمام مرہٹہ رئیسوں کو متحد و متفق رکھ سکتی۔ لہٰذا جب تک اس کا مقابلہ ہندوستانی حریفوں سے رہا جو اس سے بھی زیادہ غیر مستقل اور زوال پذیر تھے، اس وقت تک حکومت پونا ظاہراً بہت اچھی حالت میں رہی لیکن جب ایک تیسری اور تازہ دم بیرونی قوت سیاسیات کے میدان میں داخل ہوئی جس کی کامیابی کا انحصار ہی اہل ہند کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھانے پر تھا، تو مرہٹوں میں سب سے پہلے حکومت پونا ہی زد میں آئی اور اُسی نے نقصان اٹھایا اور پھر ایک ایک کرکے دوسرے مرہٹہ رئیس بھی مغلوب و سرنگوں ہوتے گئے۔

مرہٹوں کے زوالِ قوت کا دوسرا قوی سبب جسے ان کی تاریخ کے مشہور مصنف گرانٹ ڈف نے جا بجا جتایا ہے[1] یہ تھا کہ ابتداً ان کی سپاہگری قزاقانہ قسم کی تھی اور اسی طرز جنگ کے لیئے وہ طبعاً موزوں تھے جس میں نہ کسی باقاعدہ اور منتظم فوج کی ضرورت ہے اور نہ کسی فن حرب کے ماہر سپہ سالار کی۔ پس جب تک وہ دوسروں کے ملک پر تاخت تاراج کرتے رہے ان کا زور رہا لیکن جب یہ دوسری قوتیں اندرونی اسباب اور کچھ مرہٹوں کی یورشوں سے کمزور ہوکر معدوم ہوگئیں اور ان کے علاقوں پر مرہٹوں کا تسلط ہوا تو پھر انہیں قزاقی کی بجائے ریاست و حکومت کی شان بنانی پڑی، باقاعدہ فوجیں اور توپ خانے رکھنے پڑے اور یہ وہ پابندیاں تھیں جن سے مرہٹہ قوم کو کوئی مناسبت نہ تھی چنانچہ جہاں جہاں ان کی مستقل حکومت قائم ہوئی وہاں شاید دو نسلیں بھی نہ گزری تھیں کہ ان کی فوجوں میں مرہٹہ عنصر کم ہوگیا حتیٰ کہ ۱۷۹۱ء ہی میں پونا سے جو فوج آراستہ ہوکر شمال کی جانب روانہ ہوئی اس کے پیادوں اور توپ خانے میں کوئی مرہٹہ سپاہی نہ تھا اور سواروں میں بھی وسط ہند کے بہت سے پنڈارے شامل تھے[2]۔ اسی طرح مادھوجی سندھیا جس نے مرہٹوں میں سب سے زیادہ قوت حاصل کرلی تھی اور جو توپ و تفنگ کی اہمیت کو بخوبی سمجھتا تھا، غیر مرہٹہ فوجیوں کا محتاج ہوگیا تھا، اس کے بہترین سپہ سالار بھی غیر قوم بلکہ غیر ملک کے لوگ تھے، اور ان میں دو فرانسیسی سردار، دیبوئنی اور پیراں خاص طور پر مشہور ہیں۔

۲۔ حیدرآباد، (و میسور)

---

[1] مثلاً۔ دیکھو گرانٹ ڈف کی تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۱۰۵۔

[2] "سندھیا"، مؤلفہ کین صفحہ ۵۶۔

خاندانِ آصف جاہی

اس انقلابِ عظیم کے وقت، جب کہ سلطنتِ مغلیہ کی پُرشکوہ عمارت گر رہی تھی اور مرہٹوں کی غارتگری نے سارے ملک میں تہلکہ ڈال دیا تھا، اُن کے ہمسائے میں دکن خاص کے علاقوں کا محفوظ و مصئون رہنا خاندانِ آصف جاہی کی حیرت انگیز قابلیت و مستعدی کا ثبوت ہے۔

یہ نامور خاندان شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی اولاد میں ہے اور اس کے جدِ امجد خواجہ عابد "کہ پدرش عالم شیخ از عظمائے اکابر سمرقند... بود" عہد شاہجہانی میں ہندوستان آئے اور عہد اورنگ زیب میں قلیچ خاں کے خطاب اور منصب چہار ہزاری سے مفتخر ہوئے، چند سال بعد ان کے فرزند میر شہاب الدین اور بھائی خواجہ بہاء الدین بھی ہندوستان چلے آئے اور سلطنت کے نہایت معزز عہدوں پر سرفراز ہوتے رہے۔ تاریخ میں میر شہاب الدین اپنے شاہی خطاب "غازی الدین فیروز جنگ" سے مشہور ہیں۔

دکن سے ابتدائی تعلق

دربارِ اورنگ زیب کے ان گرامی قدر امیروں کے تفصیلی حالات ہمعصر تواریخ میں جستہ جستہ اور مآثر الامرا میں یکجا موجود ہیں لیکن اس مختصر کتاب میں بھی یہ کہنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بیجاپور و گولکنڈے کی فتوحات میں یہ دونوں سردار بادشاہ کے سب سے عزیز و محترم رفقا میں تھے اور بیجاپور کی فتح کا جو اطلاع نامہ دفترِ شاہی سے شایع ہوا اس میں قدرشناس بادشاہ نے یہ فقرہ اپنے قلم سے تحریر کیا تھا کہ بیجاپور... "بدستیاری فرزند بے ریو و رنگ غازی الدینخاں بہادر فیروز جنگ مفتوح شد"

اسی طرح گولکنڈے کے محاصرے میں سپہ سالاری کے فرائض نواب قلیچ خاں کے تفویض کر دیئے گئے تھے اور انھوں نے یہیں گولے کے زخم سے انتقال کیا (۱۰۹۸ھ)، اورنگ زیب کو اس واقعے کا نہایت ملال ہوا، مرحوم کی اولاد مزید اعزاز و اکرام شاہی سے مفتخر ہوئی مگر حق یہ ہے کہ قضا و قدر کی طرف سے اس جانثاری کا جو صلہ ملا وہ تمام بادشاہی انعامات سے بڑھ چڑھ کر تھا کیونکہ بادشاہ کے حکم سے جب محاصرین اپنے مرحوم سپہ سالار کی نعش کو لشکرگاہ کے قریب دفن کر رہے تھے[1] تو یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی کہ وہ درحقیقت دکن میں اسی بہادر امیر کے خاندان کی آیندہ فرمانروائی کی بنیاد جما رہے ہیں۔

نواب نظام الملک آصف جاہ اول

اسی موقعے پر مرحوم کے نوجوان پوتے میر قمرالدین کو منصب چہار ہزاری اور چین قلیچ خاں بہادر کا خطاب عطا ہوا اور آیندہ کارناموں کے صلے میں مزید ترقی ہوتی رہی لیکن میر قمرالدین کی فراست و تدبر کی آزمایش کا سب سے نازک وقت وہ تھا جب کہ سادات بارہہ فرخ سیر کو معزول و مقتول

[1] یہ تاریخی مقبرہ حیدرآباد و گولکنڈے کے درمیان آصف نگر میں موجود ہے۔

کرنے کے بعد حکومت کے قریب قریب مالک بن بیٹھے تھے اور سلطنت مغلیہ کے قدیم اُمرا کا ہر حیلے سے استیصال کر رہے تھے۔ ان سیدوں کی شکست و زوال کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ مغل بادشاہ کو میر قمرالدین خاں کی شجاعت و قابلیت اور اسی خاندان کے دوسرے رکن محمد امین خاں پسر خواجہ بہاءالدین کی سعی و کوشش نے بادشاہ گر سیدوں سے مخلصی دلائی تھی اور آئندہ بھی یہ خاندان سلطنت کی جس خلوص ولیاقت کے ساتھ خدمت گزاری کرتا رہا، اس کی بہت سی مثالیں تاریخ میں محفوظ ہیں حتیٰ کہ یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ محمد شاہ کو اپنے طویل عہد حکومت میں جب کبھی مصائب نے خواب عشرت سے بیدار کیا تو انتہائی پریشانی کے وقت میں اسی خاندان کے افراد خاص کر نواب میر قمرالدین خاں سلطنت کے واسطے سینہ سپر ہو گئے۔ محمد شاہ کی جانب سے اس خدمت و جانسپاری کا اگر کوئی قابل یادگار صلہ ملا تو وہ صرف خطاب آصف جاہ تھا (۱۱۴۰ھ) ورنہ اس بادشاہ نے اپنے کم عقل اور حاسد امیروں کے اغوا سے بارہا نواب موصوف کے ساتھ بُرا سلوک کیا اور گجرات اور مالوے کی طرح دکن کے صوبوں کو بھی آصفجاہ سے لے لینے کی درپردہ کوششیں کیں؛

یہ کوششیں خود سلطنت کے لیئے موجب نقصان تھیں، خیر خواہی اور وفاداری کے باوجود نواب نظام الملک کو دہلی کی ناقدردان حکومت کے حاسدانہ احکام کی تعمیل میں دکن سے دست بردار ہونا گوارا نہ تھا اور کچھ عرصے کے واسطے حفاظتِ ذاتی کی بدولت بادشاہ کا نواب نظام الملک پر عتاب بھی ہوا لیکن آخر میں محمد شاہ کو اپنے بہترین امیر کی مخالفت سے پشیمانی ہوئی اور بادشاہ کی پریشانیاں دیکھکر نواب آصفجاہ نے بھی گذشتہ شکایات بھلا دیں اور اڑے وقت میں رفاقت و جانبازی کے لیئے پھر دہلی آنا منظور کر لیا (۱۱۴۹ھ) لیکن پچھلے دس بارہ برس میں گجرات و مالوہ مرہٹوں کی آماج گاہ بن گئے تھے بادشاہ کا خزانہ خالی اور فوج کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی تھی۔ لہذا اب مذکورہ بالا صوبوں سے مرہٹوں کے اخراج میں نواب آصف جاہ کی مساعی بھی کارگر نہ ہو سکیں اور مالوے کی چند ہفتے کی لڑائی میں چار و ناچار باجی راؤ سے دب کر صلح[1] کرنی پڑی (اقرار نامہ بھوپال ۱۱۵۰ھ، ۱۷۳۸ء)

جیسا کہ صاحب مآثرالامرا نے تصریح کی ہے، مرہٹوں سے اس موقع پر جس طرح ممکن ہو پیچھا چھڑانے اور ان کی من مانی شرائط قبول کر لینے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انہی دنوں

---

[1] یہ وہ مصالحت نہیں ہے جس کا پہلے ذکر آیا ہے اور جس کا زمانہ ۱۱۴۴ ہجری تھا۔

نادر شاہ کی آمد آمد کی خبر گرم تھی[۵۱] اور حکومتِ دہلی سے مطلق امید نہ تھی کہ بطورِ خود اس نئے خطرے کا تدارک کر سکے گی پس نواب آصف جاہ کو جلد سے جلد مالوے سے واپس آنا پڑا اور نہ صرف کرنال کے میدان میں جنگی مدافعت بلکہ حملہ آوروں سے بعد کی مصالحت بھی درحقیقت زیادہ تر آصفجاہ کی سعی و تدبیر کا نتیجہ تھی جس کی خود نادر شاہ نے داد دی تھی[۵۲]۔

مرہٹوں کو تھوڑے ہی دن میں معلوم ہو گیا تھا کہ بھوپال کے اقرار و مدار محض دفع الوقتی کیواسطے تھے جن کے ایفا کی کوئی امید نہ تھی[۵۳]، لہٰذا انھوں نے اس مرتبہ دکن کے علاقوں پر یورش کی جہاں آصف جاہ کا منجھلا فرزند، میر احمد ناصر جنگ، نائب صوبہ دار تھا اور فوج کا بڑا حصہ دہلی گیا ہوا تھا، دکن کو گجرات کی طرح تاراج کرنے کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا لیکن ناصر جنگ کی دلیرانہ مدافعت نے مرہٹوں کی ہمت پست کر دی اور انھیں مالی زیر باری اور نقصان کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا (۱۷۴۲-۴۳ء) اور ادھر کچھ عرصے بعد خود نواب آصف جاہ نے دکن پہنچ کر عنانِ انتظام اپنے ہاتھ میں لی۔

اندرونی نظم و نسق

نواب آصف جاہ کے باقی ایامِ زندگی دکن ہی میں بسر ہوئے، یہاں پہنچتے ہی اول تو ناصر جنگ نے باپ سے سرکشی کی لیکن لڑائی میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا اور قدر دان باپ نے نہ صرف جان بخشی کی بلکہ بہادری کی داد دی، پھر نواب آصفجاہ نے ملک ارکاٹ کی تسخیر پر توجہ کی جس کے مفتوحہ علاقے مرہٹوں کی تاخت و تاراج اور کچھ مقامی رئیسوں کی سرکشی سے صوبہ دارِ دکن سے منحرف ہو گئے تھے آصف جاہی افواج نے ترچناپلی تک (جس پر مرہٹے قابض تھے) تمام اضلاع کو از سرِ نو فتح کیا،

---

[۵۱] مآثر الامرا - جلد سوم ۵۰۸ ۔

[۵۲] اہلِ دہلی اپنے ہر دلعزیز و محترم نواب آصفجاہ کی آمد سے جس قدر مسرور و مطمئن ہوئے تھے اسکی شہادت میں یہ مشہور قطعۂ تاریخ نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ:-

صد شکر کہ ذاتِ دیں پناہی آمد رونق دہ ملک بادشاہی آمد
تاریخ رسیدنش بگوشم ہاتف گفت "آیتِ رحمتِ الٰہی آمد"

[۵۳] اس حقیقت کو خاص طور پر جتانے کی ضرورت ہے کیونکہ ڈف اور دیگر انگریز مورخ مذکورۂ بالا جنگ اور مصالحت کو مرہٹوں کے کامل غلبے کا ثبوت بتاتے ہیں حالانکہ خود ان کے آیندہ بیانات سے اس کی تردید ہوتی ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ باجی راؤ کی یہ کامیابی محض عارضی اور نواب آصف جاہ کی وقتی مشکلات کا نتیجہ تھی۔

(۱۱۵۵ھ۔ ۱۷۴۲ء) پھر یہاں کی حکومت (یا نظامت) انورالدین خاں کے تفویض کر کے نواب آصفجاہ نے اورنگ آباد کو مراجعت کی۔

آصف جاہ اوّل نے برہانپور میں انتقال کیا (جمادی الآخرہ ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء) اور دو بیٹیاں اور چھ فرزند چھوڑے جن میں سے ایک نواسے اور چار بیٹوں نے کم سے کم رسمی طور پر مرحوم کی جانشینی کا شرف حاصل کیا۔ لیکن ان واقعات کو پڑھتے وقت مناسب ہے کہ خاندان آصف جاہی کے مشاہیر کا شجرہ پیش کر دیا جائے:۔

آصف جاہ کے جانشین

خواجہ عابد قلیچ خاں

میر شہاب الدین المخاطب بہ غازی الدین خاں (اوّل)

میر قمرالدین نظام الملک آصف جاہ (اوّل)

نواب غازی الدین خاں (فیروز جنگ ثانی) — عماد الملک غازی الدین خاں (ثالث) وزیر دہلی

(میر احمد) ناصر جنگ

(میر محمد) صلابت جنگ

(میر نظام علی) نظام الملک آصف جاہ (ثانی)

(میر محمد شریف) بسالت جنگ

دختر — میر ہدایت محی الدین مظفر جنگ

نواب سکندر جاہ ” ” ثالث

نواب ناصرالدولہ ” ” رابع

نواب افضل الدولہ ” ” خامس

نواب میر محبوب علیخاں ” ” سادس

اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علیخاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ و دولتہ

آصف جاہ اوّل کا فرزند اکبر نواب غازی الدین خاں باپ کی طرف سے نیابتہً دربار دہلی میں امیرالامرا تھا اور دکن میں ضرورت کے وقت یہ خدمت دوسرا بھائی نواب ناصر جنگ انجام دے چکا تھا اس کی جنگی اور انتظامی قابلیت مسلّم تھی اور باپ کے انتقال کے بعد وہی نظام الدولہ ناصر جنگ کے خطاب سے مسند صوبہ داری پر متمکن ہوا، پھر اسی زمانے میں جب احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت دربار دہلی سے طلبی ہوئی تو وہ فوج لیکر دکن سے روانہ ہوا تھا کہ ادھر تو بادشاہ نے فسخ عزیمت کی ہدایت کی اور ادھر اس کے بھانجے ہدایت محی الدین خاں نے خود دکن میں علم سرکشی بلند کیا۔ اس نوجوان امیر زادہ کو نواب آصفجاہ اول کی جانشینی کا دعوے تھا اور چندا صاحب اور دوپلے جیسے سازشی رفیق مل گئے تھے، چندا صاحب اصلی نام

حسین دوست خاں ہے اور وہ کرناٹک یا ارکاٹ کے ان مقامی (نوائت) رئیسوں کا سرگروہ تھا جنھیں آصف جاہ اول نے بے دخل کرکے انورالدین کو وہاں کا ناظم بنا دیا تھا اور دوپلے دکن میں اہل فرانس کی تجارتی کوٹھیوں کا صدر عامل یا گورنر تھا جنھوں نے تقریباً نصف صدی پہلے ساحل کورومنڈل پر ایک گاؤں (پھل چیری) خرید کر اسے اپنا صدر مقام اور سب سے بڑی تجارتی بندرگاہ بنا لیا تھا یہی جگہ تاریخ میں پانڈی چیری (یا لا یان دی شیری ۱ بلا) کے نام سے مشہور ہے۔

جنگ کرناٹک

فرنگی سوداگروں کے ہندوستان آنے اور ملک گیری کا منصوبہ سوچنے کے حالات آئندہ باب میں یکجا ہماری نظر سے گزریں گے، اس جگہ یہ لکھنا کافی ہے کہ دوپلے پہلا فرنگی ہے جس نے اہل ہند کی کمزوریوں کو تاڑا اور انھیں آپس میں لڑا کر خود حکومت قائم کرنے کا وسیع و پیچیدہ جال تیار کیا تھا۔ اس سازش میں چنداصاحب کو تو فرانسیسیوں کے ساتھ برابر کا شریک سمجھنا چاہیئے لیکن جو صید غافل سب سے پہلے اس جال میں پھنسا وہ ہدایت محی الدین خاں المخاطب بہ مظفر جنگ ہے تو شرکاء سازش کو شروع میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے انورالدین خاں ناظم کرناٹک پر حملہ کیا اور وہ اتفاق سے پہلی ہی جنگ میں مارا گیا (۱۱۶۲ھ) ملک پر یہ "اتحادی" قابض ہو گئے۔ لیکن ابھی وہ خوشیاں ہی منا رہے تھے کہ نواب ناصر جنگ نے فوج کثیر کے ساتھ اورنگ آباد سے کوچ کیا اور سازش کے اصلی مرکز یعنی پانڈی چیری کے قریب تک آپہنچا۔ صوبہ دار دکن کی اس یلغار نے اتحادیوں میں ہل چل ڈال دی۔ مظفر جنگ اور چنداصاحب کے تمام رفیق سمٹ کر پانڈی چیری سے کچھ فاصلے پر جمع ہو گئے اور فرانسیسی سپاہ کی بہت بڑی تعداد ان کی امداد کے واسطے آئی۔ فرنگی سپاہی، جن کی قواعد دانی اور بہادری کی بے سروپا تعریف سے جدید تواریخ ہند کے ورق سیاہ نظر آتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو ایشیا میں دراصل اکثر موقعوں پر فریق مقابل کی باہمی نااتفاقی اور غداری سے لڑائیاں جیتی ہیں اور اس موقع پر بھی دوپلے برابر سازباز میں مصروف تھا لیکن اس ریشہ دوانی کا کوئی نتیجہ نکلنے نہ پایا تھا کہ فرنگی سپاہیوں نے محض مرعوب ہو کر ایک رات بغیر کسی بڑی لڑائی کے فرار اختیار کیا اور کمال بزدلی سے اپنے رفیق مظفر جنگ کو تنہا چھوڑ گئے جو صبح کو معمولی زد و خورد کے بعد گرفتار کر لیا گیا۔[1] (ربیع الثانی ۱۱۶۳ھ ۱۷۵۰ء)

فرانسیسی نفوذ دربار دکن میں

مگر اُورم لکھتا ہے کہ مذکورۂ بالا ناکامی کے باوجود مکار دوپلے اس بات سے مایوس نہ ہوا تھا کہ

[1] مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۵۰۳۔ اُورم جلد اول صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰۔ مسٹر لیین صاحب لے حسب دستور ان واقعات کے بیان کرنے میں بہت سی تاویلات پیش کی ہیں "ہسٹری اوف دی کارنیج ان انڈیا" صفحہ ۲۸ وغیرہ — ہو

نواب ناصر جنگ کے دربار میں کسی نااتفاقی کا پتہ لگالیگا یا خود کوئی ایسا نفاق پیدا کردےگا جس سے عیاری کے ساتھ اپنا کام نکل آوے اور دوبارہ مظفر جنگ اور چندا صاحب کے بگڑے ہوئے معاملات کی اصلاح ہو سکے،، اس کا خیال صحیح نکلا چند مہینے کی ریشہ دوانی سے نواب کے چند پٹھان امیر دوپلے سے مل گئے اور انہی غداروں کی تحریک سے فرانسیسیوں نے نواب کی فوج پر شبخون مارا پھر جب ناصر جنگ ہاتھی پر سوار ہو کر خود سپاہیوں کی ہمت بندھانے نکلا اور ان پٹھانوں کی طرف بھی آیا تو ان میں سے ایک پٹھان امیر (ہمت خاں نامی) نے اپنے آقا ناصر جنگ کے گولی لگائی وجہ میں وہ مرکر ہاتھی سے نیچے گرا فوراً اس کا سر کاٹ لیا ہو (۱۱۹۴ء ۱۷۵۰ء)

اہل سازش نے اسیوقت مظفر جنگ کو قید سے نکال کر مسند دکن پر بٹھا دیا تھا اور جب وہ بھی تھوڑے دن بعد باہمی نفاق و شورش کا شکار ہوا تو نواب آصفجاہ اول کے تیسرے فرزند نواب صلابت جنگ کی مسند نشینی کا اعلان کر دیا جو مظفر جنگ کی طرح فرانسیسیوں کی طرف مائل تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ فرانسیسی فوج کے سردار موسیو بوسے (بوسی) کو دربار دکن میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا اور اس میں شک نہیں کہ اس نے ریاست کو بیرونی حملوں سے بچانے میں جانبازی اور قابلیت بھی دکھائی، یہ بیرونی حملے مرہٹوں نے کیئے تھے لیکن انھیں اصلی قوت و تحریک نواب غازی الدین خاں (ثانی) سے پہنچ رہی تھی جو اپنے باپ نواب آصف جاہ اول کی وراثت کا دعوی دار تھا اور صوبہ داری دکن کی سند لے کر دہلی سے فوج کشی کی تیاریاں کر رہا تھا، اس نے اپنی مدد کے معاوضے میں مرہٹوں کو ملک خاندیس دینے کا وعدہ کیا تھا اور اس کی آمد سے پہلے مرہٹہ حلیفوں نے صلابت جنگ سے لڑائی چھیڑ دی تھی لیکن اول تو یہ حملے چنداں کارگر نہ ہوئے اور ادھر نواب غازی الدین خاں کا اورنگ آباد پہنچتے ہی انتقال ہو گیا پس یہ جھگڑا جس کی نسبت خوف تھا کہ سخت خانہ جنگی کی صورت اختیار کرلے گا ایک ہی سال میں رفع دفع ہو گیا (۱۱۶۵ء ۱۷۵۲ء) اور اس اثناء میں فرانسیسیوں کو دربار میں مزید قوت حاصل ہو گئی۔ سال آئندہ جنوبی اڑیسہ کے چار بڑے بڑے اضلاع کی سند بھی انھیں مل گئی جو فوجی مصارف کے لیئے بطور جاگیر عطا ہوئے تھے اور انکی سالانہ آمدنی کا تخمینہ تقریباً چالیس لاکھ روپیہ کیا جاتا تھا۔

امرائے دکن کی خود غرضی اور باہمی نااتفاقی نیز فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے آئندہ پانچ سات برس تک ملک دکن کی حالت میں بہت ابتری رہی مگر اسی بدنظمی نے خاندان آصف جاہی کے سب سے بہتر فرد کو

نواب نظام علیخاں آصفجاہ ثانی

سلہ یعنی سرکارہائے مصطفےٰ نگر، ایلور، راجمندر رام اور چکاکول جو اب "شمالی سرکاروں" کے نام سے احاطۂ مدراس میں شامل ہیں ہو

مسندِ فرمانروائی پر پہنچنے کا موقع دیا اور کچھ عرصے دیوان رہنے کے بعد نواب میر نظام علیخاں نے نظام الدولہ آصفجاہ ثانی کے خطاب سے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی (۱۱۷۵ھ ۱۷۶۲ء)

واضح رہے کہ نواب صلابت جنگ کی کمزوری اور غیر سیر و لغزنری کی سب سے آخری اور قوی وجہ وہ لڑائی ہوئی تھی جس میں مرہٹوں نے اُسے اودگیر کے قریب گھیر کر خاندیس ویرار، نیز دولت آباد و بیجاپور کے وسیع علاقے دینے پر مجبور کر دیا تھا (۱۱۷۱ھ [illegible]) لہٰذا نواب میر نظام علیخاں بہادر کی سب سے پہلی کوشش یہ تھی کہ جس طرح ہو سکے اس نقصان کی تلافی کی جائے اور پانی پت میں مرہٹوں کی سخت ہزیمت نے کامیابی کا خداداد موقع دے دیا تھا۔ چنانچہ آیندہ دو تین سال تک مرہٹوں سے برابر جنگ ہوتی رہی جسمیں نواب نظام الدولہ بہادر کی فوجوں نے ایک مرتبہ خاص پونا تک بڑھکر اس شہر کو جلا دیا (۱۱۷۶ھ [illegible]) اور اس کے جواب میں مرہٹوں کی اورنگ آباد و حیدرآباد پر یورش ناکام رہی۔ آخر نصف سے زیادہ کھویا ہوا علاقہ لے کر نواب نظام الدولہ بہادر نے مرہٹوں سے صلح کر لی۔

انگریزوں سے تعلقات

اس مصالحت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اب انگریز نہ صرف اپنے فرانسیسی حریفوں پر غالب آگئے تھے بلکہ بنگال وارکاٹ میں بھی ان کا عمل دخل ہوتا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں شاہ عالم (ثانی) سے بالا ہی بالا انھوں نے شمالی سرکاروں کا فرمان لے کر اس علاقے پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ اس کارروائی کی حیدرآباد میں اطلاع ہوئی تو نواب نظام الملک کو نہایت غصہ آیا اور فوج کشی کی تیاریاں کی گئیں کہ انگریزوں کو سرا اس علاقے سے خارج کر دیا جائے لیکن پلاسی کے فاتح ابھی سر میدان میں کودنے کے لیئے تیار نہ تھے انھوں نے دب کر سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج اور بوقت ضرورت خراج گزاری کی حیثیت سے کچھ امدادی فوج دینے کا عہد کر لیا اور ان شرائط پر نواب نظام الملک نے وہ سرکاریں انھیں کے قبضے میں رہنے دیں[1] (۱۱۸۰ھ ۱۷۶۶ء) بایں ہمہ انگریزوں نے یہ روپیہ کئی سال تک ادا نہیں کیا اور مختلف عذرات کی بنا پر لیت و لعل کرتے رہے نیز نواب نظام الملک کی میسور سے جنگ چھڑی تو اس میں حسب معاہدہ امدادی فوج بھی نہ بھیجی۔ حالانکہ چند سال بعد جب خود ان کو ٹیپو سلطان سے جنگ پیش آئی تو اس میں حیدرآباد کی سپاہ برابر کی شریک تھی اور تاوانِ جنگ اور مفتوحہ علاقے میں اس ریاست کو بھی قریب قریب برابر کا حصہ ملا (محاربات میسور ۱۲۰۵ھ ۱۷۹۰ء تا ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۲ء) لیکن اس متحدہ جنگ و فتح کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حکومت پونا سے نواب نظام الملک کی پھر لڑائی چھڑ گئی اور بیدر کے قریب عین معرکۂ جنگ میں بعض غداروں نے دغا دی۔ نواب نظام الملک کو

[1] دیکھو ہسٹوریکل اینڈ ڈسکرپٹو اسکیچ ۔۔۔ نظام ڈومینینز صفحہ ۸۸، نیز اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۵۸ ۔

سبب کر قلعۂ کھرڑا میں پناہ گزیں ہونا پڑا اور مرہٹوں کے حسب منشا شرائط تسلیم کرنی پڑیں (۱۲۰۹ھ) اس موقع پر بھی انگریزوں نے معاہدات کے خلاف کوئی کمک نہ بھیجی پس نواب نظام الملک نے انکی امدادی فوج متعینہ حیدرآباد کو برطرف کر دیا[51]۔

ان واقعات نے نواب نظام الملک کو دوبارہ فرانسیسیوں کی مدد سے اپنی فوج کو جدید قواعد و اسلحۂ جنگ سے آراستہ کرنے پر آمادہ کیا اور چند ہی سال کی کوشش میں حیدرآباد میں ایک اعلیٰ درجے کی فوج مرتب ہوگئی جو جدید ترین آتشی اسلحہ سے مسلح تھی اور جس کی جنگی ضروریات کے لیئے خود حیدرآباد میں توپ و بندوق ڈھالنے کے بڑے بڑے کارخانے بن گئے تھے ان کارخانوں کی غالباً ہندوستان بھر میں نظیر نہ تھی اور ان کے ساختہ اسلحہ کی ہمعصر انگریزوں نے جا بجا تعریف کی ہے کہ وہ یورپ کے بہترین اسلحہ سے کسی طرح کم پایہ نہ تھے[52]۔

حیدرآباد کی جدید قواعد داں فوج کو موسیو ریموں اور پیراں جیسے لائق و کارداں فرانسیسی سردار مل گئے تھے جنھوں نے مختلف معرکوں میں اپنی رفاقت و سپہ سالاری کے جوہر دکھاکر دربار دکن میں نہایت ہردلعزیزی حاصل کرلی تھی اور ولیعہد ریاست (نواب سکندرجاہ) نیز دیگر امرا ریموں کے بڑے قدرداں تھے لیکن یہاں خاص طور پر یاد رکھنے کے لائق بات یہ ہے کہ یہ فرانسیسی ملازمین ڈوپلے کے پہلے فرستادوں کی طرح ریاست حیدرآباد کے درپردہ دشمن نہ تھے کہ اپنے قومی فوائد یا ملک ستانی کے لیئے ریاست کو کمزور و بے قابو کرنے کی سازشیں کرتے۔ لہذا ان سے نواب نظام الملک کی قوت کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا لیکن حیدرآباد کا بجائے خود ایک قوی ریاست بن جانا اور وہاں فرانسیسیوں کی موجودگی ان کے قومی رقیب انگریزوں کو گوارا نہ ہوسکتی تھی۔ وہ موقع کی تاک میں لگے ہوئے تھے اور جب ریموں نے وفات پائی (۱۲۱۳ھ) تو انھوں نے یک بہ یک حیدرآباد کی جدید سپاہ کو گھیر کر ہتھیار رکھوا لیئے اور اس ایک ہی چال میں نواب نظام الملک کی جنگی قوت کو ایسا نقصان پہنچا دیا کہ ونسنٹ اسمتھ کے قول کے بموجب انگریزوں کو نہ ریاست حیدرآباد کی دشمنی کا خوف رہا نہ دوستی کی تمنا[53]۔ غرض اس طرح ریاست کی خود مختاری میں روز بروز کمی ہوتی گئی ادھر انگریزی مقبوضات اور جنگی قوت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا حتیٰ کہ ہندوستان کی اور ریاستوں کے ساتھ ریاست حیدرآباد بھی رفتہ رفتہ اُن کی سیادت

[51] ہسٹوریکل اینڈ ڈس کرپٹو اسکیچ ۔۔۔ نظامز ڈومی نینز، صفحہ ۹

[52] ہسٹوریکل اینڈ ڈس کرپٹو اسکیچ ۔۔۔ نظامز ڈومی نینز، ۱، صفحات ۸ تا ۱۰، ۳۲۹

[53] آکسفرڈ ہسٹری صفحہ ۵۵۲ ۔ نیز دیکھو سرنیل ... ایشیا صفحہ ۱۰۰ وغیرہ

کے تحت میں آگئی ہو

میسور کی اسلامی ریاست

ریاست حیدرآباد اور مرہٹوں پر انگریزوں کی بالادستی کے ضروری واقعات ہم آئندہ پڑھیں گے یہاں جنوبی ہند کی ایک اور اسلامی قوت کا مختصر حال بیان کر دینا مناسب ہے جو اسی زمانے میں ایک خود مختار و طاقتور حکومت بن گئی تھی اور گو اس کے قیام کا سلطنت مغلیہ کے زوال سے کوئی براہ راست تعلق نہ تھا لیکن وہ ہندوستان کے اسی عہد انقلاب کی سب سے دلچسپ تاریخی یادگار ہے۔

ابتدائی تاریخ اور مغلیہ سلطنت سے تعلق۔

جیسا کہ ایک انگریز تاریخ نویس نے جتایا ہے[1] "وہ تمام علاقہ جسے آجکل میسور کہتے ہیں حیدر علی سے پہلے کبھی کسی حکومت واحدہ کے زیر نگیں نہ ہوا تھا" بلکہ جب سے اس کی تاریخ کا سراغ ملتا ہے اس وقت سے اس علاقے میں دو تین ریاستیں قائم تھیں اور اس پورے علاقے پر سلطنت وجیانگر کا بھی قبضہ نہ تھا۔ پھر جب وجیانگر کی قوت میں زوال آیا اور چھوٹے چھوٹے پرگنوں کے زمیندار، جنھیں "پالی گار" یا "نائک" کہتے ہیں، خود مختار ہو گئے تو میسور یا سری رنگ پٹن (سرنگاپٹم) کے حاکم (یا "وڈیار") کی حیثیت بھی اس وقت ایک بڑے زمیندار سے زیادہ نہ تھی اگرچہ اس کے قبضے میں دوسروں کی نسبت زیادہ علاقہ تھا۔

یہ ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ میسور کے ان رئیسوں کا حکومت بیجاپور سے بھی کوئی مستقل سیاسی تعلق تھا یا نہیں لیکن جس وقت اورنگ زیب نے دکن کی ریاستوں کو فتح کیا تو سری رنگ پٹن کے وڈیار کی طرف سے وکیلوں نے حاضر دربار ہو کر اطاعت و باج گزاری کا اقرار کیا اور اس کے جواب میں وہاں کے رئیس کو بادشاہ کی جانب سے "راجہ" کا خطاب ملا۔ بعد کی تاریخی شہادتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے راجہ صوبہ دار دکن کے ماتحت اور سلطنت مغلیہ کے باج گزار سمجھے جاتے تھے اور نواب ناصر جنگ نے مظفر جنگ اور چندا صاحب کے خلاف کرناٹک پر فوج کشی کی، تو اس موقع پر سری رنگ پٹن یا میسور کے راجہ نے بھی نواب نظام الملک کو بحیثیت باج گزار امدادی فوج بھیجی تھی،

صوبہ دار دکن کے ساتھ میسور کے ان ماتحتانہ تعلقات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم نواب نظام الملک اور حیدر علی میں آئندہ مخالفت کے صحیح اسباب نہیں سمجھ سکتے اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ دربار حیدرآباد نے میسور کی اسلامی بادشاہی کا خاتمہ کرنے میں اس قدر سرگرمی کیوں دکھائی ہو۔

حیدر علی کا تسلط

الغرض یہ سری رنگ پٹن کا نالائق راجہ (چک دیوراج) جس نے اورنگ زیب سے حکومت کی

---

[1] ملاحظہ ہو "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان"، مولفہ بوورنگ سابق کمشنر میسور، صفحات ۱۵، ۱۰، ۲۳۱ نیز دیکھو ماثر الامرا جلد سوم صفحہ ۵۰۰ وغیرہ وغیرہ۔

سند حاصل کی تھی، فوت ہوا (سنہ ۱۱۴۶ھ) تو اس کی اولاد میں کوئی راجہ ایسا نہ ہوا جو اولوالعزمی یا عمدہ اوصاف حکمرانی سے مشرف ہوتا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی باگ رفتہ رفتہ اس کے وزیر جنگ یا "دلوائی" کے قبضے میں آگئی اور خاندانی راجہ محض "شاہ شطرنج" سمجھے جانے لگے، ادھر یہی زمانہ ہے جب کہ عام روایتوں کی بموجب حیدر علی کے قریشی النسل اجداد شمالی ہند سے ترک وطن کر کے دکن آئے اور بارہویں صدی ہجری کے وسط میں ان کا خاندان بنگلور میں آبسا، حیدر علی کا باپ (فتح محمد) کرناٹک کی لڑائیوں میں مارا گیا تھا مگر اس نے اور اس کے بھائی اسمٰعیل نے میسور کے دلوائی کی فوجی ملازمت اختیار کی جس میں اپنی دلیری اور کارگزاری سے وہ رفتہ رفتہ ترقی کرتے گئے، در غالباً ۱۱۶۸ھ میں حیدر علی ضلع ونڈیگل کا فوجدار مقرر ہوا، یہاں اس نے پیادہ اور سوار فوج کی ایک بڑی جمعیت فراہم کی اور فرانسیسیوں کی مدد سے گولے بارود کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر لیا اور مجموعی طور پر اتنی قوت و شہرت حاصل کر لی کہ دو سال کے بعد جب مرہٹوں نے میسور پر یورش کی تو دلوائی نے حیدر علی ہی کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا اور محض اس کی مستعدی اور عمدہ سپہ سالاری کی بدولت حملہ آور تاوان جنگ لے کر ٹل گئے اور میسوری اضلاع ان کے ہاتھ میں پڑنے سے بچ گئے (۱۱۷۳ھ)۔

حیدر علی کا اس قدر اقتدار دیکھ کر میسور کے موروثی راجہ کو خیال آیا کہ اس کی مدد سے کر دلوائی کے پنجے سے رہائی حاصل کرے اور جب حیدر علی نے دلوائی کو نکال کر خود حکومت کا مالک بننا چاہا تو راجہ نے مرہٹوں کو مدد کے واسطے بلایا۔ حیدر علی کو میسور سے بھاگنا پڑا اور مرہٹے واپس چلے گئے تو اس وقت بھی حیدر علی بہ مشکل اپنے رقیبوں کو زیر کر سکا لیکن تقریباً دو سال کی جد و جہد کے بعد آخر کار اسے کامیابی ہوئی اور ۱۱۷۵ھ سے ہم اس کو ریاست میسور کا خود مختار حاکم کہہ سکتے ہیں۔ اتفاق سے انہی دنوں نواب نظام الملک کے بھائی بسالت جنگ نے سیرا پر فوج کشی کی تھی، یہ مقام میسور کے شمال میں، اورنگ زیب کے سب سے جنوبی صوبے کا مستقر تھا اور ان دنوں اس پر مرہٹے قابض تھے۔ بسالت جنگ کو اسے فتح کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی، لیکن حیدر علی نے اسے تین لاکھ روپے دے کر سیرا کی صوبہ داری اپنے نام لکھوائی اور اسی سند میں اسے "نواب حیدر علی خاں" کا خطاب دے دیا گیا، مگر ظاہر ہے کہ یہ بسالت جنگ کی بے قاعدہ کارروائی تھی اور دربار دکن میں اس خطاب و سند کو کبھی نہیں مانا گیا چنانچہ حیدرآباد کی ہمعصر تاریخوں میں میسور کے نئے حاکم کو ہمیشہ "حیدر نائک" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حیدر علی کی فتوحات

بہر حال اب حیدر علی ریاست میسور کا خود مختار حاکم تھا موروثی راجہ کی حیثیت ایک شاہی

نظر بند سے زیادہ نہ تھی اور دوسرے رقیب بھی مغلوب ہو گئے تھے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا اُس زمانے میں میسور یا سری رنگ پٹن کا علاقہ موجودہ ریاست میسور کی نسبت بہت کم تھا اور حیدر علی کی اولوالعزمی ایسی چھوٹی ریاست پر قناعت نہ کر سکتی تھی، چنانچہ آیندہ بیس برس تک اس کی تمام زندگی جنگ و جدال میں گزری جس میں سے بعض لڑائیوں کی غرض کشور کشائی تھی اور باقی ان مفتوحہ علاقوں کی حفاظت کے واسطے ہوتی رہیں، اس کی فتوحات کے تفصیلی حالات لکھنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اجمالی طور پر اس قدر لکھنا مناسب ہوگا کہ حیدر علی نے غالباً چیتل درگ اور بدنور کی ابتدائی فتوحات کے بعد ہی جنوبی ہند میں ایک وسیع سلطنت قائم کرنے کا منصوبہ سوچ کر اس کی تکمیل میں رفتہ رفتہ کورگ ـــ اور ساحل ملیبار کا تمام علاقہ فتح کر لیا تھا مرہٹوں کی پیہم یورشں اور نواب نظام الملک اور انگریزوں کی شدید مخالفت کے باوجود شمال اور مشرق کی طرف بھی اس کی حدود سلطنت برابر بڑھ رہی تھیں اور ایک زمانے میں انگریزوں کو خود کرناٹک و مدراس کی سلامتی مخدوش نظر آنے لگی تھی ؛

ٹیپو سلطان

انگریزوں کے ساتھ ریاست میسور کی لڑائیوں کے حالات ہم آیندہ پڑھیں گے، جنگ کا یہی سلسلہ جاری تھا کہ اس کے دوران میں حیدر علی نے وفات پائی (۱۱۹۵ھ ۱۷۸۲ء) اور اس کا بڑا بیٹا فتح علی ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا "سلطان" کا لقب خود حیدر علی نے کبھی اختیار نہیں کیا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کے آخری زمانے میں بادشاہی کے تمام لوازم جمع ہو گئے تھے، اس کی خود مختاری ۱۷۵۶ء سے مسلم تھی، دکن کے صوبہ دار سے ماتحتی اور خراج گزاری کا تعلق بالکل منقطع ہو چکا تھا اور جنگی قوت و ریاست میں اضافے کے ساتھ حیدر علی کو اب نواب نظام الملک کی ہمسری کا دعوے تھا اور یہی وہ بات تھی جس نے حیدر آباد کی حکومت کو میسور کا سخت مخالف و رقیب بنا دیا ۱۷۹۲ء میں اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کی نواب ساونور کی بیٹی سے شادی کی تو سری رنگ پٹن میں یہ رسم شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی، اسی طرح دیگر تقریبات یا دربار وں کے موقع پر ہم حیدر علی کو بادشاہی لباس میں جلوہ گر پاتے ہیں اور فیل سفید پر اس کی سواری کا جلوس اسی ماہی مراتب اور ساز و سامان کے ساتھ نکلتا ہے جو خاص بادشاہوں کی شان تھی ؛

ٹیپو کے عہد میں قدرتی طور پر بادشاہی کی یہ شان زیادہ نمایاں ہو گئی ریاست میسور سرکاری طور پر "سرکار خداداد" کے نام سے موسوم ہوئی اور "حیدر نائک" کے فرزند نے "سلطان" کا پر شکوہ لقب اختیار کیا جسے دہلی کے برائے نام تاجداروں کے جیتے جی دکن کے طاقتور

صوبہ داروں نے بھی اپنے واسطے جائز نہ رکھا تھا، ایک اعتبار سے ٹیپو کی یہ خود نمائی لچہ بیجا نہ تھی رقبہ میں تقریباً انگلستان کے مساوی ملک اس کے زیر نگین تھا، نوے[1] ہزار جنگ آزما سپاہی اس کے حکم پر سر کٹوانے کے لیئے تیار تھے، روپے پیسے اور جنگی ساز و سامان کے ذخائر باپ کے ترکہ سے ملے تھے اور اندرونی طور پر بھی اس کی ریاست خاصی منتظم حالت میں تھی لیکن[2] سلطان میسور کی یہی سطوت و قوت جس نے ٹیپو کو مغرور بنایا، اس کے ہمسایوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور حیرت یہ ہے کہ ایسے خطرناک دشمنوں سے مقابلہ ہونے کے باوجود ٹیپو سلطان نے غالباً اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کیا کہ میسور کی نئی سلطنت کی بنیادیں نہایت ناپائیدار ہیں، بے شبہ حیدر علی نے اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کی تھی اور وقتی حالات سے فائدہ اٹھا کر بہت قوت بہم پہنچالی تھی لیکن یہ ظاہر ہے کہ اہل ملک اسے دل میں محض غاصب سمجھتے تھے اور اس کے ہم قوم یا ہم مذہب لوگوں کی کوئی ایسی بڑی تعداد میسور میں آباد نہ تھی جو اس نئی حکومت کے استحکام کی ضامن ہوتی، ادھر ہمسائے میں تین بڑی طاقتیں موجود تھیں جنھیں کسی جوتھے رقیب کا خود مختار و قوی ہونا کسی طرح گوارا نہ تھا، اس حالت میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی بہترین حکمت عملی بظاہر یہی ہو سکتی تھی کہ جس طرح ممکن ہوتا ریاست حیدر آباد سے دوستانہ تعلقات قائم رکھتے اور کم سے کم رسمی طور پر میسور کی سابقہ باج گزاری کو نباہتے کہ ہمسائیوں کو حسد کرنے کا زیادہ موقع نہ ملتا، لیکن دولت و قوت حاصل کرنے کے بعد آدمی ایسی مصلحت بینی کو باعث عار سمجھنے لگتا ہے اور ٹیپو سلطان کا تو یہ قول مشہور ہے کہ دو سو برس بھیڑ بن کر جینے سے کہیں بہتر ہے کہ میں صرف دو دن شیر کی طرح زندہ رہوں،[1] چنانچہ گو ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء کی لڑائیوں میں اس کا نصف کے قریب ملک چھن گیا (عہد نامہ سرنگا پٹم ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء) اور وہ کبھی اپنے ملکی محصولات بڑھا بڑھا کے از سر نو بڑی اور بحری فوجیں فراہم کرنے کی کوشش اور کبھی فرانسیسیوں کے ساتھ ساز باز کرتا تھا کہ اپنے تینوں دشمنوں کا تنہا مقابلہ کر سکے لیکن خود ان دشمنوں کی باج گزاری یا اطاعت قبول کرنے کا اسے کبھی خیال نہ آیا اور آخر اسی جذبۂ خود مختاری کی خاطر اس نے جان دی (۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء) اسی کے ساتھ جنوبی ہند کی آزاد حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا ۞

۳ ۔ شمالی ہند کی ریاستیں

(۱) بنگالہ بنگالہ سلطنت مغلیہ کا سب سے وسیع صوبہ تھا اور اس میں موجودہ بنگال اور بہار (و اڑیسہ)

---

[1] حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان، صفحہ ۱۱۹

[2] حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان، صفحہ ۲۲۳

سکے تمام اضلاع شامل تھے لیکن صدر مقام ڈھاکہ تھا، صوبے کی زرعی خوش حالی اور بعض صنعتیں صدیوں سے مشہور تھیں اور گیارہویں صدی ہجری میں فرنگی تاجروں کی آمد و رفت کی بدولت اس کی بحری تجارت میں بھی نمایاں ترقی ہوگئی تھی، مگر اسے مرطوب آب و ہوا اور وبائی امراض نے بدنام کر رکھا تھا مغل امرا اس دور دست علاقے میں آنے سے گھبراتے تھے اور مستعد کارگزار عہدہ داروں کی کمی سے اکثر یہاں کے مالی انتظامات میں ابتری رہتی تھی۔ اورنگ زیب کے آخری عہد میں اس کا عزیز اور لائق پوتا شہزادہ عظیم الشان بنگالے کا صوبہ دار تھا لیکن غالباً مالئیے کی حالت اس وقت بھی اصلاح طلب تھی کہ بادشاہ نے **محمد ہادی** نامی (ایک نو مسلم برہمن) کو پہلے اڑیسہ اور پھر کل بنگالے کا دیوان بنا کر دکن سے ڈھاکے بھیجا اور اس نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قابلیت سے یہاں کی آمدنی بڑھا دی، نئے دیوان کی جزرسی نے جب شہزادہ عظیم الشان کے مصارف کو روکا تو شہزادہ دیوان سے بہت ناخوش ہوگیا بلکہ شہزادے کے اشارے سے ایک مرتبہ چند سپاہیوں نے دیوان پر حملہ بھی کیا لیکن وہ قابو میں نہ آیا اور جب بادشاہ کو ان باتوں کی اطلاع ہوئی تو اس نے پوتے کو لکھ بھیجا کہ محمد ہادی بادشاہی نوکر ہے "اگر سر موئے ضرر جانی یا مالی بہ او خواہد رسید انتقام آں از آں بابا خواہد کشید[۵۱]"

یہی محمد ہادی ہے جو چند روز بعد مرشد قلی خاں اور پھر نواب **جعفر خاں** کے خطاب سے بنگالے کا صوبہ دار بنایا گیا اور ۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۵ء تک اس عہدے پر سرفراز رہا، ڈھاکہ چھوڑ کر مرشد آباد کے مرکزی مقام کو اسی نے بنگالے کا مستقر بنایا اس کا پرانا نام مخصوص آباد یا مقصود آباد بدل کر مرشد آباد کے نام سے اس کو نہایت رونق و ترقی دی، انتظامی قابلیت کے علاوہ اس کی سخت گیری اور انصاف پسندی ضرب المثل تھی اور کہتے ہیں کہ ایک مظلوم کے قصاص میں اس نے خود اپنے بیٹے کو جان سے مروا دیا تھا۔[۵۲]

جعفر خاں اپنے نواسے سرفراز خاں کو جانشین بنانا چاہتا تھا لیکن خود سرفراز خاں کے باپ شجاع الدین والیٔ اڑیسہ نے یہ بات گوارا نہ کی۔ بیٹے نے بھی اس کے سامنے سر جھکا دیا اور دربار دہلی نے اسی (شجاع الدین) کو **شجاع الدولہ** اسد خاں کے خطاب سے بنگالے کا صوبہ دار تسلیم کر لیا۔ آئندہ تیرہ سال تک شجاع الدولہ نے حکومت کی اور جعفر خاں کی طرح وہ بھی نہایت منتظم اور لائق صوبہ دار

۵۱۔ رقعات عالمگیری۔ نیز دیکھو ریاض السلاطین ۲۵۰

۵۲۔ ریاض السلاطین صفحہ ۲۸۵

گزرا ہے جس کے سب فارسی اور انگریزی تاریخ نویس مداح ہیں،

علی وردی خاں شجاع الدولہ اور نیز اس کا بیٹا سرفراز خاں حکومتِ دہلی کے فرمانبردار رہے اور گو بنگالے کے صوبہ داروں نے آیندہ بھی کبھی علانیہ خود مختاری کا دعویٰ نہیں کیا لیکن صدر حکومت کی کمزوری سے سب سے پہلے جس شخص نے فائدہ اٹھایا وہ پٹنے کا حاکم محمد علی وردی خاں تھا جسے خود شجاع الدولہ نے ادنیٰ مرتبے سے ترقی دیکر امرائے شاہی میں داخل کرایا تھا۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد سرفراز خاں مارا گیا اور علی وردی خاں نے پورے صوبے پر قبضہ کرلیا، (۱۱۵۳ھ ۱۷۴۰ء)

یہ کارروائی حکومتِ دہلی کی بغیر اجازت و خلاف منشا عین اس وقت عمل میں آئی جب کہ نادر شاہ کے حملے نے مغل تاجدار کو پہلے سے بھی زیادہ کمزور کر دیا تھا، ادھر علی وردی خاں نے خراج کے نام سے تحائف اور کچھ روپیہ بھیجکر اطاعت و باج گزاری کا اقرار کیا، اور آیندہ بھی اس رسم کو نباہتا رہا، پس حکومتِ دہلی نے طوعاً و کرہاً اس کو بنگالے کا صوبہ دار تسلیم کرلیا لیکن نہ تو علی وردی خاں کی یہ اطاعت سچی تھی اور نہ بادشاہ دہلی اسے کافی سمجھتا تھا چنانچہ بیس برس کے بعد شہزادۂ عالی گہر (شاہ عالم ثانی) کے ادھر آنے کی اصلی وجہ یہی تھی کہ وہ بنگالے میں مغلوں کے قدیمی حقوق بادشاہی کو از سرِ نو قائم کرنا چاہتا تھا اور علی وردی خاں کے جانشینوں کو بنگالے کا حاکم جائز تسلیم نہیں کرتا تھا۔

شہزادۂ موصوف کی جدوجہد کا اجمالی حال ہم آیندہ پڑھیں گے یہاں خاص طور پر جتانے کے لائق یہ امر ہے کہ علی وردی خاں کی مذکورۂ بالا بغاوت و کامیابی نے بنگالے کے مقامی امرا در عہدہ داروں میں سخت انتشار و ناراضی پیدا کر دی اور مقتول صوبہ دار (یعنی سرفراز خاں) کے ہوا خواہوں سے جب خود مقابلہ نہ ہوسکا تو انھوں نے مرہٹوں کو مدد کے واسطے بلایا، اور ایک دو مرتبہ ناکامی کے بعد آخر میں مرہٹوں کی سالانہ یورش نے علی وردی خاں کو ایسا عاجز کیا کہ اُسے خاص بنگالہ بچانے کی خاطر اڑیسے کا صوبہ مرہٹوں کے حوالے کرنا پڑا اور بہت دن تک یہ علاقہ برار کے بھونسلہ حاکموں کے زیرنگیں رہا لیکن ان کی اس "حکومت" کی صورت صرف یہ تھی کہ چھٹے چھ ماہے مرہٹہ سوار اس طرف کا گشت لگاتے اور جس قدر ممکن ہوتا روپیہ جبراً رعایا سے وصول کرکے واپس چلے جاتے تھے![1]

علی وردی خاں کی وفات کے بعد اس کا نواسہ نواب سراج الدولہ اس کا جانشین ہوا

سلہ گزیٹیر جلد ہفتم صفحہ ۲۱۲

(۱۱۶۹ھ ۱۷۵۷ء) لیکن اس کی حکومت کے پہلے ہی سال میں خانہ جنگیوں کے علاوہ انگریزوں سے جنگ چھڑ گئی جس نے انجام کار ان مغربی تاجروں کو ملک بنگالہ کا مالک بنا دیا۔

شمالی ہند کی ایک اور بڑی اور نیم آزاد ریاست خاص دوآب کے علاقے میں قائم ہوئی جسے سہولت کے لیئے "حکومت اودھ" کہتے ہیں، اس میں روہیل کھنڈ سے حدود بہار تک کے اقطاع داخل تھے اور ایک زمانے میں روہیل کھنڈ بھی فتح ہو کر شامل ہو گیا تھا اس ریاست کا بانی ایک ایرانی سوداگر برہان الملک سعادت خاں تھا جس نے اپنی سپاہیانہ قابلیت سے محمد شاہ کے عہد میں بڑی ناموری پائی اور الہ آباد و اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا لیکن اودھ کی جنگی قوت کو بڑھانے والا اس کا جانشین اور بھتیجا صفدر جنگ تھا جو آصف جاہ اوّل کے بعد سلطنت دہلی کا وزیر ہوا اور عرصے تک وہاں کی درباری سازشوں میں الجھا رہا، اس کی وفات اور اس کے بیٹے شجاع الدولہ کی جانشینی (۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء) کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں، پانی پت کی تیسری جنگ کے وقت شجاع الدولہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تھا لیکن آخر وقت تک مرہٹوں سے ساز باز کرتا رہا اور اس کی فوج نے لڑائی میں بھی کوئی قابل لحاظ حصہ نہیں لیا اسی طرح اگرچہ شاہزادہ عالی گہر (بادشاہ عالم ثانی) کو بنگالے پر حملہ کرنے کی تحریک میں وہ پیش پیش تھا لیکن درحقیقت اس حملے کا خاص محرک شجاع الدولہ کا چچیرا بھائی محمد قلی خاں ناظم الہ آباد ہوا اور شجاع الدولہ نے اُسے شہ دی تاکہ وہ اور شاہزادہ عالی گہر اُس کی حدود سے باہر چلے جائیں، اور بنگالے کی لڑائیوں میں اُلجھے رہیں اور خود شجاع الدولہ کو ان کی کسی سازش و رقابت کا خوف نہ رہے پھر تین چار سال کے بعد میر محمد قاسم والیٔ بنگالہ نے بہار سے بھاگ کر اس سے مدد مانگی، اور شجاع الدولہ نے شاہ عالم کے ساتھ ملکر دوبارہ بہار پر فوج کشی کی لیکن معاہدۂ اتحاد و دوستی کے باوجود شجاع الدولہ نے اپنے مہمان (میر قاسم) سے دغا کی اور اس کی فوج کے فتنہ پرداز فرانسیسی سردار سمرو یا شمرو کو ملا کر اپنا رفیق بنا لیا اور اس بے بسی میں میر قاسم کو ایک عرصے تک نظر بند رکھا، اس دغا بازی سے شاید وہ بہار کے بعض اضلاع پر خود قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن اوّل تو انگریزوں نے اسے بکسر پر شکست دی (۱۱۷۸ھ ۱۷۶۴ء) دوسرے خود شاہ عالم اس کا ساتھ چھوڑ کر

---

[1] سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۶۵۶ وغیرہ یہ حالات اور آیندہ میر قاسم والی بنگالہ کے ساتھ شجاع الدولہ کی دغابازی کا ذکر سیر المتاخرین کی دوسری جلد میں بہت تفصیل سے مرقوم ہے اور اس کتاب کا مولف ان واقعات کے وقت موجود اور اکثر معاملات میں خود شریک تھا۔

انگریزوں کے لشکر میں چلا آیا جنھوں نے اب خاص شجاع الدولہ کے ملک پر پیش قدمی کی اور والیٔ بنگالہ سے فریب و حسد کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود اسے بہت سا روپیہ انگریزوں کو دینا پڑا اور اضلاع کانپور و الہ آباد و فتحپور شاہ عالم کے حوالے کرنے پڑے ؛

انگریزوں کا اثر

چند سال بعد جب شاہ عالم انگریزوں سے ناخوش ہو کر دلی گیا تو الہ آباد کو پھر شجاع الدولہ کے سپرد کر گیا تھا لیکن اب بادشاہ کے مرہٹہ رفیقوں کا زور ہوا اور انھوں نے شاہ عالم سے الہ آباد کی سند حاصل کر لی، اسی سلسلے میں انھوں نے روہیل کھنڈ پر حملہ کیا اور شجاع الدولہ کو اپنا ملک بچانے کی خاطر انگریزوں سے امداد لینی پڑی، اس فوجی امداد کے عوض میں اس نے انگریزوں کو چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ دینے کا اقرار کیا اور اودھ کے صدر مقام فیض آباد میں مستقل طور پر انگریزی سفارت قائم ہو گئی جسے آیندہ انگریزی سیادت و حکومت کی تمہید سمجھنا چاہئے (۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء) لیکن اس وقت البتہ شجاع الدولہ کو اس اتحاد سے یہ نفع پہنچا کہ اس نے انگریزوں کی مدد سے روہیل کھنڈ پر فوج کشی کی اور سوائے ریاست رامپور کے یہ تمام علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ؛

سال آیندہ شجاع الدولہ نے وفات پائی (۱۱۸۸ھ) اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں انگریزوں کا اثر آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ خود سعادت علی خاں کو جو شجاع الدولہ کے بعد سب سے لائق اور باخبر نواب اودھ مانا جاتا ہے، قریب قریب آدھا ملک انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا (۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء) اور کہنا چاہئے کہ اس وقت سے اودھ انگریزی حکومت کے بالکل تحت میں آ گیا؛[1]

اودھ کی بعد کی تاریخ اہم سیاسی واقعات سے خالی ہے اور اس ملک پر براہِ راست انگریزی قبضہ ہونے تک یہاں کے باقی نوابوں یا بادشاہوں کے حالات میں صرف اُن کی عیاشی کے عبرتناک قصے محفوظ رہ گئے ہیں، ان رنگ رلیوں کا مرکز لکھنؤ میں تھا جسے آصف الدولہ نے فیض آباد کی بجائے اپنا پایۂ تخت بنا کے بڑی ترقی دی، ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سعادت علیخاں کے زمانے تک اودھ کے فرمانروا سلطنت دہلی کے قدیم خطاب "نواب وزیر" سے مخاطب کیے جاتے تھے لیکن سعادت علیخاں کے جانشین غازی الدین حیدر نے ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء میں انگریزوں کے مشورے سے "شاہ اودھ" کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کا علحدہ سکہ جاری کیا اور یہ وہ جسارت تھی جس کا ٹیپو سلطان کے سوا ہندوستان کے کسی رئیس و راجہ نے

[1] اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۹۰۵۔ گورنر جنرل ولزلی کی یہ ایسی کھلی ہوئی زیادتی اور عہد شکنی تھی جس کا قریب قریب تمام انگریز مؤرخوں کو اعتراف کرنا پڑا ؛

اقدام نہ کیا تھا کیونکہ وہ اپنی خود مختاری کے اعلان کو اب تک نام نہاد سلاطین مغلیہ کے لحاظ و ادب کے خلاف جانتے تھے ؛

(۳) پنجاب یوں تو پایۂ تخت کے قریب ہی روہیلے اور جاٹ حکومتِ دہلی کے خلاف شورش و بغاوت کرتے رہتے تھے اور فرخ آباد، پیلی بھیت، رامپور، بھرتپور وغیرہ مقامات میں انکی کئی آزاد ریاستیں قائم ہوگئی تھیں لیکن اس کتاب میں ہم صرف سکھوں کی آزاد ریاست کا ذکر کریں گے جو سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد پنجاب میں قائم ہوئی۔ قوم و نسل کے اعتبار سے یہ سکھ بھی اکثر جاٹ تھے مگر ایک خاص مذہبی فرقہ بن جانے کی وجہ سے انھیں اپنے دوسرے ہمقوموں اور عام ہندوؤں سے امتیاز حاصل ہوگیا اور بعد کے سیاسی اقتدار نے اس امتیاز کو اور بھی نمایاں کردیا ؛

مذہبی طور پر سکھ مت کے لوگ اوّل اوّل مسلمان صوفیوں کا ایک فرقہ سمجھے جاتے تھے اور بانیٔ مذہب گرو نانک صاحب نے اپنی تعلیم میں وحدتِ وجود اور انسانی مساوات پر ہی سب سے زیادہ زور دیا ہے لیکن بعد میں جب ان کے دینی پیشواؤں نے ان کو علیحدہ سیاسی یا فوجی گروہ بنانا چاہا تو لازمی طور پر ان کے عقائد و شعائر میں بھی ہندو مسلمانوں کے مذہب سے اختلافات پیدا ہوئے اور دسویں گرو گوبند سنگھ نے ان اختلافات کو اور زیادہ واضح کردیا حتیٰ کہ خود سکھ مت کے معتقد اس تجدید و اصلاح سے ناراض ہوگئے اور گرو گوبند سنگھ کو بہ مشکل ان پر غلبہ حاصل ہوا ؛

انگریزی تاریخوں میں اس بات کو بہت شد و مد سے بیان کیا ہے کہ گرو گوبند سنگھ کی مذہبی اصلاح کا سب سے بڑا مقصود یہ تھا کہ سکھوں کو مسلمانوں (اور نیز برہمنوں) کا سخت دشمن بنادیا جائے[1] لیکن جب ہم پڑھتے ہیں کہ خود یہ گرو شاہ عالم بہادر شاہ کی فوج میں بھرتی ہوکر مسلمانوں کی طرف سے لڑنے دکن آئے، تو مذکورہ بالا اقوال کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سکھوں نے جب کبھی ست نامیوں[2] کی طرح، مشرقی پنجاب کے کوہستانی اضلاع میں سر اٹھایا، تو ان کی سختی سے

---

[1] مثلاً دیکھو سیل گریفن کی کتاب "رنجیت سنگھ" نیز اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۴۲۵ وغیرہ۔

[2] ستنامی ایک ہندو مذہبی فرقہ تھا جس میں بالعموم ہندو جنبیہ ور داخل ہوگئے تھے اور ان کی سب سے بڑی تعداد نارنول (ریاست پٹیالہ) کی نواح میں آباد تھی۔ جب کسی ستنامی سے کوتوالی کے کسی جوان کا جھگڑا ہوا اور اس نے بڑھتے بڑھتے بلوے بلکہ بغاوت کی صورت اختیار کرلی۔ حتیٰ کہ شورش فرو کرنے کے لیے شاہی فوجوں کو بھیجنا پڑا اور خاص باقاعدہ جنگ کے بعد یہ فساد رفع ہوا۔ یہ عہد عالمگیر کا واقعہ ہے اور اپنی پہلی تاریخ (براہ فیسٹ رک) میں ہم اس کا ذکر کرچکے ہیں ؛

تنبیہ و تادیب کی گئی اور اس سلسلے میں شاہی افواج کے ساتھ ان کی کئی خونریز لڑائیاں ہوئیں، آخر کار گوبند سنگھ کا جانشین بندہ فرخ سیر کے عہد میں محصور ہو کر گرفتار ہوا اور دہلی میں سخت عقوبتوں کے ساتھ قتل کرا دیا گیا (۱۷۱۵ء ۱۱۲۶ھ) تو اس وقت یہ شورش بھی فرو ہو گئی۔

سکھوں کی "بارہ مسلیں"

لیکن جس وقت احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور اندرونی جھگڑوں نے دربار دہلی کی فوجی قوت کو کمزور کر دیا تو سکھوں کو دوبارہ سر اٹھانے کا موقع ملا اور ان کے سرآوردہ زمینداروں نے جا بجا اسی بارہویں صدی ہجری کے وسط میں وہ "مسلیں" یعنی جتھے بنانے شروع کیے جو بعد میں خاصی قوی ریاستیں بن گئیں۔ ان مسلوں کی ابتدائی حیثیت قزاقانہ گروہوں کی سی تھی اور انکے شرکا گرد و نواح کا علاقہ لوٹتے پھرتے تھے، ان کا اس زمانے میں زیادہ زور سرہند و لاہور کی نواح میں تھا اور انہی شہروں کو لوٹنے کی سزا میں ایک مرتبہ احمد شاہ ابدالی نے خاص سکھوں پر فوج کشی کی (۱۷۶۲ء ۱۱۷۵ھ) اور ستلج کے پار (برنالے کے قریب) انھیں سخت شکست دی اور بہت سا تاوان جنگ وصول کیا، لیکن اس شکست نے سکھوں کو بہت فائدہ پہنچایا، عام قومی مصیبت میں وہ اپنے اندرونی جھگڑے بھول گئے اور دوبارہ انھوں نے ملکر سرہند پر چڑھائی کی اور شہر کو فتح کر لیا، احمد شاہ ابدالی سال آئندہ بھی پنجاب آیا تھا لیکن سرہند کی طرف بڑھنے کی فرصت نہ ملی اور اسنے خود ہی سکھ سردار آلا سنگھ کو سالانہ پیشکش کے وعدے پر ضلع سرہند کی حکومت سونپ دی، تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک بادشاہ کی جانب سے سکھوں کو ایک محدود ضلع کا حاکم تسلیم کیا گیا اور اس کے بعد سے انکی مسلیں مسلمان حکومتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر روز افزوں قوت حاصل کرنے لگیں، ان مسلوں کے مفصل حالات اس تاریخ میں لکھنے بے محل ہونگے، یہاں مختصر طور پر یہ لکھنا کافی ہے کہ ان کی بارہ مسلّوں میں سے پانچ سب سے زیادہ طاقتور اور مشہور تھیں، ۱۔ پھولکیاں، اہلو والیہ، بھنگی، کہنے یا، اور رام گڑھیا، آخر کی چاروں مسلوں کا علاقہ دریائے ستلج کے شمال میں تھا، اور پھولکیاں کے جتھے میں جو سکھ زمیندار شریک تھے ان کی اولاد آج بھی پٹیالہ، جیند، وغیرہ ایں روئے ستلج اس پار کی بڑی بڑی ریاستوں کی وارث ہے؛

رنجیت سنگھ

لیکن گو برنالے کی جنگ کے بعد بارہویں صدی ہجری کے اخیر تک ان سکھ مسلوں کی قوت برابر بڑھتی رہی تاہم ان میں باہم کوئی سیاسی اتحاد نہ تھا اور ان کے سردار آئے دن آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، یہی وہ کمی تھی جسے رنجیت سنگھ (ولادت ۱۱۹۴ھ) کی اولوالعزمی نے دور کیا اور اسلیئے سکھ قوم کی سیاسی قوت کا بانی مبانی اسی کو سمجھنا چاہئے، اور اگرچہ یہ قوت کچھ زیادہ دیرپا نہ تھی بلکہ کہنا چاہئے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرتے ہی اسکا شیرازہ بکھر گیا تاہم سکھ ریاست کی یہ کمزوری بھی اسبات کا ثبوت ہے کہ خود

رنجیت سنگھ اپنی قوم میں نہایت غیر معمولی قابلیت کا سردار تھا ؛

ابتدا میں رنجیت سنگھ اپنے باپ کے بعد سکھوں کی ایک چھوٹی مسل کا حاکم ہوا تھا جو اپنے مرکزی مقام کے نام پر سکرچکیا کہلاتی تھی، سکر چک کو رنجیت سنگھ کے بزرگوں نے امرتسر کے ضلع میں آباد کیا تھا لیکن اسی زمانے سے اُن کی قزاقانہ یورشوں کا حلقہ دریائے جہلم تک وسیع تھا اور یہی سبب ہوا کہ جب احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ زماں کی بھاری توپیں پنجاب سے جاتے وقت دریائے جہلم کی ریتی میں دھنس گئیں تو اس نے رنجیت سنگھ سے وعدہ کیا کہ اگر انکو بہ احتیاط نکلوا کر کابل بھیجدیا گیا تو اُسے راجہ کا لقب اور شہر لاہور کی حکومت عطا کر دی جائے گی (۱۲۱۳ھ ۱۷۹۸ء) رنجیت سنگھ نے اس خدمت کو مستعدی سے انجام دیا اور سال آیندہ راجہ کے شاہی خطاب کے ساتھ لاہور میں داخل ہو کر باضابطہ اس شہر پر قابض ہو گیا ؛

واضح رہے کہ لاہور پر کئی سال سے افغانیوں کی حکومت برائے نام باقی رہ گئی تھی ورنہ اس پر بھی سکھ سردار قابض تھے اور اس لیئے آیندہ چند سال تک رنجیت سنگھ کی انہی سکھ سرداروں سے لڑائیاں ہوتی رہیں جن کے آخر میں قریب قریب پنجاب خاص کے تمام علاقوں میں اس کی سیادت تسلیم کی جانے لگی اور اس نے ستلج کی سکھ ریاستوں کے معاملات میں بھی وہ مداخلت کرنے لگا، بلکہ کچھ روز کے واسطے انبالے پر قابض ہو گیا لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب کہ انگریز دہلی پر مسلط ہو گئے تھے اور ہلکر سے لڑائیوں کے ضمن میں ستلج اِس پار کے سکھ سرداروں تک ان کا اثر پہنچ گیا تھا، معلوم ہوتا ہے ان سکھ سرداروں کو اپنے ہمقوم راجہ کا باج گزار بننا گوارا نہ تھا اور اس کی جنگی قوت کا وہ مقابلہ نہ کر سکتے تھے لہذا انھوں نے اپنی حفاظت کے عوض میں انگریزوں کی سیادت قبول کر لی اور انگریزوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے عہد لیا کہ وہ ستلج اِس پار کے علاقوں سے کوئی سروکار نہ رکھے گا ؛ (عہدنامہ امرتسر ۱۸۰۹ء)

فتوحات ملتان کشمیر وغیرہ

شمالی ہند کی سب سے بڑی قوت سے مصالحت کرنے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ستلج کے شمال میں مزید فتوحات کی بخوبی فرصت مل گئی، اور اس نے چند ناکام حملوں کے بعد آخر کار شہر ملتان کو فتح کر لیا (۱۲۳۳ھ ۱۸۱۸ء) جہاں کا حاکم مظفر خاں کئی سال تک حیرت انگیز شجاعت و مردانگی سے سکھوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا اور آخر میں بھی جب تک وہ زندہ رہا قلعۂ ملتان کو سکھ فتح نہ کر سکے ؛

کشمیر کی فتح میں رنجیت سنگھ کو ملتان کی فتح سے بھی زیادہ نقصانات اٹھانے پڑے اور یہاں کے افغانی حاکموں نے کئی بار اُسے سخت شکستیں دیں لیکن ۱۲۳۵ھ میں جب کہ کشمیر کا افغان حاکم دربار کابل

کے اندرونی جھگڑوں میں حصّہ لینے افغانستان چلا گیا تھا سکھوں نے پھر اس ملک پر حملہ کیا اور اس مرتبہ ان کی کوئی ناص مزاحمت نہ ہوئی، اور یہ خوبصورت صوبہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت میں داخل کرلیا گیا۔

رنجیت سنگھ کے آخری عہد کی لڑائیاں زیادہ تر پشاور و ڈیرہ جات کے علاقے میں ہوتی رہیں اور اگرچہ حکومت کابل کی اندرونی کمزوری اور سرحدی پٹھانوں کی باہمی نااتفاقی سے پشاور پر سنہ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء ہی میں سکھوں کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن یہ قبضہ جوکھوں سے خالی نہ تھا اور انھیں آئندہ بیس برس تک اس کے واسطے بہت سی قیمتی جانیں اور بے شمار روپیہ صرف کرنا پڑا اور کبھی حکومت کابل سے اور کبھی یہاں کے باشندوں سے مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں شاہ سید احمدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے مذہبی جہاد کی روح پھونک دی تھی۔

سکھوں کی سلطنت پنجاب پر انگریزی تسلّط کے حالات آئندہ ابواب میں ہماری نظر سے گزرینگے یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ یہ سلطنت دہلی اور کابل کی حکومتوں کی کمزوری کے زمانے میں رنجیت سنگھ کی ذاتی قابلیت و مستعدی سے قایم ہوئی تھی اور اس کی وفات (۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۹ء) کے ساتھ ہی اُس کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد سکھوں میں کوئی ایسا لایق اور صاحب تدبیر سردار پیدا نہ ہوا جو اپنی جنگجو قوم کو پوری طرح قابو میں لاکر متحد رکھ سکتا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیمتی میراث کو اُس نئی قوت کے ہاتھ میں پڑنے سے بچا لیتا جو شمالی ہند میں سلاطین مغلیہ کی جانشین ہو گئی تھی۔

باب دوم

اہل یورپ کی آمد ہند میں

مغربی ممالک سے بحری تجارت کا آغاز

ہندوستان کی تاریخ میں دسویں صدی ہجری (سولھویں عیسوی) کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ اسی صدی میں مغلوں کی عظیم الشان سلطنت قایم ہوئی اور شیر شاہی انتظامات اور اکبری فتوحات نے عرصۂ دراز کے بعد ممالک ہند کی ایک مرکزی حکومت کے ماتحت شیرازہ بندی کی نیسکن تمدن انسانی کی تاریخ میں اس سے بھی بڑھکر اہم واقعہ یہ ہے کہ اسی صدی میں ہندوستان اور نیز "نئی دنیا" کے ساتھ اہل یورپ کی براہِ راست بحری آمد و رفت کا آغاز ہوا اور دسویں صدی ہجری کے ابتدائی سنین سے پرتگال کے جہاز سواحل ہند تک آنے جانے لگے۔ اُس وقت تک دخانی جہاز ایجاد نہیں ہوے تھے اور اس لیئے اہل پرتگال و ہسپانیہ کی جہاز رانی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ ایک طرف کلمبس بحر اوقیانوس کو طے کر کے امریکہ پہنچا اور دوسری طرف واسکو دگاما اپنے تین بادبانی جہازوں کو مغربی افریقہ کے گرد چکر دے کر ہندوستان کی جنوبی بندرگاہ کالی کٹ تک صحیح سلامت لے آیا؛ (۱۴۹۸ء مطابق ۹۰۴ھ)

پرتگیزوں کے سیاسی منصوبے — سواحلِ ہند کی بحری تجارت اُن دنوں اہل عرب کے ہاتھ میں تھی لیکن پرتگیزوں نے مختلف تدبیروں سے کالی کٹ کے راجہ سے تجارت کی اجازت حاصل کرلی، اس راجہ کو وہ اور دیگر اہل فرنگ "زموران" اور اہل عرب "سامری" کے لقب سے یاد کرتے تھے مگر یاد رکھنا چاہئیے کہ پرتگیسز جہاز رانوں کی حیثیت تاجرانہ نہ تھی بلکہ ابتدا سے یہ جہاز راں شاہ پرتگال کے بحری عہدہ دار تھے اور اسی لیئے واسکو دگاما کی بخیریت واپسی پر اس کے وطن میں سرکاری طور پر خوشی منائی گئی اور اسی زمانے سے اہل پرتگال ایشیا میں اپنی سلطنت قایم کرنے کے خواب دیکھنے لگے کہ جس طرح امریکہ کے دریافت شدہ جزائر پر ہسپانیہ کا قبضہ ہوگیا تھا اسی طرح بحر ہند کے جزائر و ممالک میں پرتگال کا تسلط ہوجائے؛ چنانچہ ڈیڑھ دو سال کے بعد ہی ان کی حکومت نے تیرہ جہازوں کا

بیڑا ہندوستان کی جانب روانہ کیا جس میں بارہ سو سپاہی سوار تھے، یہ بیڑا ہوا کی ناموافقت سے جنوبی امریکہ کی جانب بہ گیا اور وہاں سے بہت دن کے بعد کالی کٹ پہنچا مگر پہنچتے ہی اُسکے سرداروں کی زمورن اور عرب سوداگروں سے لڑائی ہوگئی جس میں پرتگیزوں کے صدہا آدمی مارے گئے، اور وہ کالی کٹ میں نہ ٹھیر سکے بلکہ ان کو مجبوراً کوچین کے راجہ سے امداد لینی پڑی جو کالی کٹ کے راجہ کا رقیب تھا؛

اس مہم کی ناکامی کے بعد پھر واسکوڈگاما بیس جہازوں کا بیڑا لے کر ہندوستان آیا اور کوچین وکنانور کے رئیسوں کو ملا کر اس نے کالی کٹ پر باقاعدہ فوج کشی کی لیکن اس میں بھی چنداں کامیابی نہ ہوئی اور پرتگیز اپنے کچھ سپاہی کوچین میں چھوڑ کر واپس چلے گئے، اسی زمانے میں شاہ پرتگال نے اپنے مذہبی پیشوا یا پاپائے رومہ سے ایک "فرمان" حاصل کیا جس میں اس مسیحی بادشاہ کو حبش، عرب، ایران، وہند[1] کی تجارت، فتوحات اور جہازرانی کا، مختار تسلیم کیا گیا اور ۱۵۰۵ء (۹۱۱ھ) میں اُس نے ایک شخص المیڈا کو ہندوستان میں اپنا نائب یا "وایسرائے" بھی مقرر کردیا؛

اہل پرتگال کی یہ کارروائیاں اگرچہ مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہیں لیکن ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے ممالکِ ہند میں اپنی حکومت قایم کرنے کی فکر میں تھے اور اسی لئے ان کی عرب تاجروں یا ہندی رئیسوں سے لڑائیاں ایک حد تک سیاسی تھیں جن کے ذکر میں پرتگیزوں نے حسب دستور بہت کچھ مبالغے سے کام لیا ہے، ان کو تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کئی سال تک جدوجہد کرنے کے باوجود پرتگیزوں کو ملک گیری کے منصوبوں میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور اُن کے مشہور بحری سردار البوکرک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مغربی ساحل ہند کے ایک جزیرے، گوآ (یا الہاس) کو فتح کرلیا جو اُن دنوں سلطنت بیجاپور کے علاقے میں داخل تھا (سنہ ۱۵۱۰ء مطابق ۹۱۶ھ) پرتگیزی مصنفوں کا بیان ہے کہ اس فتح سے وہاں کے باشندے بہت خوش ہوئے تھے لیکن فتحمندوں نے جس بے دردی سے وہاں قتل عام اور غارت گری کا حکم دیا اس سے ان مصنفوں کے اقوال کی تکذیب ہوتی ہے[1]،

[1] یہ حالات کم و بیش تفصیل کے ساتھ ہندوستان کی تمام انگریزی تاریخوں میں درج ہیں لیکن ہمارا سب سے مستند ماخذ امپریل گزیٹیر ہے (جلد دوم صفحات ۴۴۴ تا ۵۰۳ و جلد دوازدہم صفحات ۲۵۰ وغیرہ) نیز دیکھو آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۳۳۱ وغیرہ وغیرہ؛

بہرحال گوآ پر اہلِ پرتگال کا قبضہ ہوگیا اور اس کو انھوں نے اس قدر مستحکم جنگی مقام بنا لیا کہ اپنے ہمسایہ اہلِ ہند (خاص کر مرہٹوں سے) اور نیز ولندیزوں سے بار بار لڑائیاں ہونے پر بھی یہ بندرگاہ اور اس سے مضافات میں کوئی تین ہزار مربع میل کا رقبہ آج تک اُن کے زیرنگیں ہے۔

ہندوستان میں یہ مقام (گوآ) یورپ والوں کا پہلا مقبوضہ تھا جسے پرتگیزوں کی بحری تجارت اور جنگی قوت کی بدولت نہایت رونق حاصل ہوئی لیکن اس قوم کی سفاکی و بداخلاقی ضرب المثل رہی ہے اور لوگوں کو سخت ظلم و جبر سے عیسائی بنانا اس کی سیاسی حکمتِ عملی میں داخل تھا لہٰذا ایشیا میں پرتگیزی حکومت کو کبھی قبولیت حاصل نہ ہوسکی اور ہندوستان میں جہاں کہیں مستقل اور بڑی حکومتیں قایم تھیں، وہاں پرتگیزوں کا اتنا زور نہ چل سکا کہ گوآ کی طرح دوسرے مقامات پر بھی متصرف ہوجاتے۔ گجرات کی بندرگاہ دیو یا دیپ کو انھوں نے سلطان گجرات سے مصالحانہ طریق پر حاصل کیا تھا (۱۵۳۵ء مطابق ۹۴۱ھ) لیکن تقریباً ایک صدی بعد بنگالے میں جب انھوں نے ہگلی کو قلعہ بند کرکے خودمختار حکومت کی شان بنانی چاہی تو شاہجہاں کے حکم سے وہ جبراً وہاں سے نکال دیئے گئے اور اُن کے جو لوگ بچ کر بھاگ سکے اُنھوں نے بنگالے کے دشوارگزار ساحلی مقامات میں رہ کر بحری قزاقی کا پیشہ اختیار کرلیا۔

پرتگیزوں کا زوال

ان سب باتوں کے باوجود، پرتگیزوں کی آمد و رفت اور جنگی نوآبادیوں سے مجموعی طور پر ہندوستان کی بحری تجارت کو فائدہ پہنچا اور انہی نے یورپ کی دوسری قوموں کو اس ملک کا راستہ دکھایا۔ خود اُن کا ملک ۱۵۸۰ء (مطابق ۹۸۸ھ) میں ہسپانیہ کی سلطنت کا جزو بن گیا تھا اور اس واقعے نے اُن کی بحری اور تجارتی ترقی کو اور بھی نقصان پہنچایا کہ یورپ کی وہ قومیں جو ہسپانیہ کی دشمن تھیں اب پرتگیزوں کو بھی ہر جگہ زک پہنچانے لگیں اور وہ اس امداد سے جو پہلے ان کی قومی حکومت دیا کرتی تھی، محروم ہوگئے۔ پھر گو نصف صدی کے بعد حکومتِ پرتگال ہسپانیہ سے علیحدہ ہوگئی، لیکن اس عرصے میں ولندیزی اور انگریز تاجر ایشیائی سمندروں میں پہنچ گئے تھے اور ان قوی رقیبوں کے مقابلے میں پرتگیزوں کی تجارت و قوت کو پہلا سا فروغ پھر حاصل نہ ہوسکا بلکہ گیارہویں صدی ہجری (سترہویں عیسوی) کے وسطی سنین میں لنکا اور ملیبار پر اُن کے جس قدر تجارتی مقبوضات تھے قریب قریب سب ولندیزوں نے چھین لیئے۔ اور ہندوستان میں اُن کی فتوحات کی داستان تاریخِ غرور و افلاس و مصائب کی عبرت ناک داستان ہے کہ خشکی کی طرف سے تو وہ ہمیشہ اُن پر دباؤ ڈالتے تھے اور سمندر میں زیادہ طاقتور مغربی قومیں ان کی جگہ لیتی چلی جاتی تھیں۔

ولندیز یا ڈچ

مغربی قوموں میں سے سب سے پہلے ولندیزوں یا ہالینڈ والوں نے پرتگیزوں کا زور توڑا تھا۔ اوّل اوّل ان ولندیزوں کی ایشیائی تجارت نے پرتگیزوں ہی کی وساطت سے ترقی پائی اور اینٹ ورپ، امسٹرڈم وغیرہ شہر شمالی یورپ میں ایشیائی اجناس کی بہت بڑی منڈیاں بن گئے جہاں پرتگیزی جہاز ممالک ایشیا کا مال لاتے اور یورپ کی اشیاء مشرق کی طرف لے جاتے تھے۔ پھر وہاں کے لوگوں نے خود ان شرقی ممالک سے تجارت کرنی چاہی اور انگریزوں کی طرح اوّل اوّل اس کوشش میں رہے کہ یورپ و ایشیا کے شمال سے مشرق کا بحری راستہ دریافت کریں۔ اس میں اُن کو ناکامی ہوئی اور آخر انہوں نے بھی بحر ہند کا (یعنی افریقہ کے گرد سے آنے کا) راستہ اختیار کیا جس سے اہل پرتگال ہندوستان پہنچے تھے۔ یورپ کی اس دوسری قوم کا پہلا ناخدا جو افریقہ کے گرد ہو کر واسکو ڈگاما سے ٹھیک ایک صدی کے بعد ایشیائی سمندروں تک پہنچا، ہاوٹمین تھا، (سنہ ۱۵۹۶ء مطابق سنہ ۱۰۰۴ھ)

اس کے بعد ولندیزوں یا ڈچوں کے اور تجارتی جہاز بھی آنے جانے لگے اور اُن کی پرتگیزوں سے کشمکش شروع ہو گئی لیکن اس موقع پر اُن کی اور اہل پرتگال کی آمد کا یہ فرق پیش نظر رکھنا چاہئیے کہ ولندیزوں کی اصلی غرض ایشیا آنے سے تجارت تھی اور اگرچہ یہ تجارت شروع ہونے کے دو تین سال بعد ہی اُن کے سب تاجروں نے مل کر تقریباً ½ ۵ لاکھ پونڈ کے سرمائے سے ایک مشترکہ کمپنی (دی یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی آف دی نیدرلینڈز) قائم کی تھی جو اُن کی ملکی حکومت کی زیر نگرانی تھی تاہم پرتگیزوں کی طرح اس کمپنی کے جہاز یا ملازمین براہ راست حکومت کے ملازم نہ تھے اور نہ پرتگیزوں کی طرح انھیں اوّل سے ممالک ایشیا کی فتح کا سودا تھا۔ کم سے کم وہ ابتدا سے ملکوں پر ہاتھ ڈالنا نہ چاہتے تھے جہاں اہل ایشیا کی مستقل اور قوی حکومتیں موجود تھیں۔

بہر حال ان کی آمد و رفت شروع ہوتے ہی بہت جلد اہل پرتگال سے تجارتی رقابت اور جنگ چھڑ گئی۔ جزیرۂ جاوا کے شہر بٹےویا کے قبضے کو اہل پرتگال نے چنداں اہمیت نہیں دی لیکن جب ولندیزوں نے سنہ ۱۶۲۱ء (سنہ ۱۰۳۱ھ) میں جزیرۂ بانڈا کا قبضہ کر لیا تو پرتگیزوں کی تجارت کو سخت صدمہ پہنچا اور ولندیزوں نے اُن جزائر ملایا (شرقی)[1] کی طرف جہاں سے

[1] ان جزیروں کو انگریزی میں عام طور پر Spices Islands (یعنی المسالے کے جزیرے) کہا جاتا ہے لیکن اس پورے مجمع الجزائر کا نام انڈونیشیا یا جزائر ملایا ہے اور مذکورۂ بالا جزیرے اس کا شرقی حصہ ہیں۔ لہٰذا ہم نے انہیں جزائر ملایا شرقی موسوم کیا ہے۔

گرم مصالحے یورپ جاتے تھے، اپنے رقیبوں کا آنا جانا دشوار کر دیا پھر اُنھوں نے لنکا سے پرتگیزوں کو شکست دے کر نکال دیا اور تین سال کی مسلسل جنگ میں رفتہ رفتہ ساحل ملیبار کے تمام پرتگیزی مقبوضات چھین لیئے (۱۰۷۳ھ مطابق ۱۶۶۳ء) یہی زمانہ ہے جس میں ولندیزوں کی تجارتی کوٹھیاں نہ صرف کورومنڈل اور بنگالے کے سواحل پر قائم ہوئیں بلکہ ڈھاکہ، پٹنہ، آگرہ، اور احمدآباد (گجرات) میں بھی اُن کے مستقل کارخانے بن گئے اور یورپ و ایشیا کے مابین تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ اُن کی کمپنی ہو گئی ؛

ولندیزوں کو اس زمانے میں تجارتی دولت اور بحری قوت نے یورپ والوں کا حسود بنا دیا تھا اور یورپ ہی میں انگریز اور فرانسیسی ہمسایوں سے اُن کی وہ جنگ چھڑی جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے (۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء) تک جاری رہی۔ انگلشی ہے نے ولندیزوں کی تمیل التجا اور قوم کو بہت مضمحل کر دیا اور جنگ کے آخری زمانے میں وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ فرانسیسیوں کے مقابلے میں انگریزوں کے حلیف ہو جائیں۔ اس اتحاد کا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ انھیں ایشیا کی تجارت میں انگریزوں کو حصے دار بنانا پڑا اور گو اُن کی بحری قوت نے فرانسیسیوں کی ہندوستانی تجارت کو کافی نقصان پہنچایا لیکن وہ خود بھی یہاں زیادہ فروغ و سرسبزی نہ حاصل کر سکے اور بارھویں صدی ہجری کے وسط میں ان کی تجارت و فتوحات کا مرکز جزائر شرق الہند کی طرف ہٹ گیا، جہاں اب تک کئی وسیع و زرخیز جزیروں پر اُن کا قبضہ ہے ؛

دیگر فرنگی اقوام کی تجارت

ہندوستان میں ولندیزوں پر انگریزوں کے غلبہ پانے کا حال اگلی فصل جب ہماری نظر سے گزرے گا۔ اس جگہ مختصر طور پر یورپ کی دوسری اقوام کا حال بیان کرنا مقصود ہے جنھوں نے پرتگال اور ہالینڈ والوں کی دیکھا دیکھی ممالک ایشیا سے تجارت کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھی اہل ڈنمارک کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ جن کی گیارھویں صدی ہجری میں سیرامپور (بنگال) میں بہت بڑی تجارتی کوٹھی قائم تھی، جرمن اور آسٹریا والوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو ایشیا سے تجارت کے بہانے اپنی بحری قوت کو بڑھانا چاہتے تھے۔ یورپ کے یہ ممالک اُن دنوں سیاسی طور پر آسٹریا کے بادشاہ کے ماتحت تھے اور وہ "شہنشاہ جرمانیہ"، یا قیصر کہلاتا تھا۔ اور ہرچند اُس زمانے میں بحری تجارت اور جنگی جہازوں کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوئی تھی جو آج کل حاصل ہے پھر بھی دسویں صدی ہجری میں جہازرانی کے فروغ اور ہسپانیہ و پرتگال کے امریکہ اور ایشیا میں ملکی مقبوضات کا حال سُن سُن کر یورپ کی باقی تمام حکومتوں کو رشک

آتا تھا۔ اور وسطی یورپ کے بعض مدبرین اس خیال سے بھی خالی نہ تھے کہ محل وقوع کی وجہ سے بحری تجارت میں انھیں جو دشواریاں ہیں، ممکن ہو تو انھیں اپنی بحری قوت بڑھا کے دور کیا جائے۔ اسی قسم کی مصلحتیں تھیں کہ چند سال کے تامل و تذبذب کے بعد جرمن شہنشاہ شہر اوسٹینڈ کے سوداگروں کا سرپرست بن گیا جنھوں نے بارھویں صدی ہجری (اٹھارویں عیسوی) کے اوائل میں ہندوستان سے تجارت شروع کی تھی (ملک بلجیم کی یہ بندرگاہ (اوسٹینڈ) اُن دنوں جرمن شہنشاہ کے زیر سیادت تھی) اور یہاں کی بحری تجارت کو ترقی دینے سے اس کا منشا یہ تھا کہ رفتہ رفتہ اس مقام کو سلطنت جرمانیہ کی بحری قوت کا ایسا مرکز بنا دے کہ ہالینڈ اور انگلستان پر اس کا دباؤ رہے۔ تجارت میں بھی اوّل اوّل "اوسٹینڈ کمپنی" کو بہت نفع ہوا اور شہنشاہ سے باضابطہ تجارت ملنے کے چوتھے سال سنہ ۱۷۲۶ء مطابق سنہ ۱۱۳۹ھ) اس کے حصے داروں میں ۳۳ فی صدی سے بھی زیادہ سالانہ منافع تقسیم کیا گیا۔ اس کمپنی نے کورومنڈل اور بنگالے میں ہگلی کے کنارے انگریزوں اور ولندیزوں کی تجارتی کوٹھیوں کے قریب اپنے کارخانے کھولے تھے اور انہی قوموں نے اس کے قیام کی سخت مخالفت کی۔ آخر شہنشاہ بعض مقامی فوائد کے عوض میں اس کمپنی کی سرپرستی سے دستبردار ہو گیا اور اُدھر ولندیزی اور انگریز تاجروں نے بنگلی کے فوجدار (یا صاحب ضلع) کو مختلف حیلوں سے جرمن تاجروں کا دشمن بنا دیا اور اُس نے تھوڑی سی فوجی جمعیت بھیج کر انھیں جبراً اپنے علاقے سے خارج کر دیا اور اُن کی تجارتی کوٹھی جس کے گرد انھوں نے خندق اور جنگی برج تیار کئے تھے، چھین کر منہدم کرا دی[1] (سنہ ۱۷۳۱ء مطابق سنہ ۱۱۴۵ھ)

اسی سال سویڈن میں ایک تجارتی کمپنی بنی اور اوسٹینڈ کمپنی کے بعض شرکا بھی اس میں حصہ دار ہو گئے۔ یہ کمپنی زیادہ تر چین و جاپان سے تجارت کرنی چاہتی تھی لیکن جرمن تاجروں کی شرکت کی وجہ سے رقیبوں نے یہ غل مچایا کہ یہ محض اوسٹینڈ کمپنی کو ایک دوسرے نام سے جاری رکھنے کی کوشش ہے اور آخر تھوڑے ہی دن بعد اس کمپنی کا کاروبار بند کر دیا گیا۔

آخر میں پروشیا کے مشہور بادشاہ فریڈرک (دی گریٹ) نے اپنی رعایا کو ممالک ایشیا سے تجارت کرنے کی ترغیب دی اور خود بھی "بنگال کمپنی" کے نام سے تاجروں کی ایک جماعت

[1] ریاض السلاطین میں فرنگی تاجروں کی باہمی رقابت اور اس لڑائی کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، صفحہ ۲۷۰،
نیز دیکھو گزیٹیر جلد دوم صفحہ ۴۶۵

مرتب کی (۱۶۱۸ء مطابق ۱۰۲۷ھ) لیکن اول تو اس کو ابتدا میں خسارہ رہا دوسرے کچھ حکومت بنگالہ کی مخالفت اور کچھ دوسرے فرنگیوں کی رقابت سے اہل ڈنمارک کو ہندوستان کے اس صوبے میں قدم جمانے کا موقع نہ مل سکا اور چند روز چوری چھپے تجارت جاری رکھنے کے بعد انکی یہ کمپنی ٹوٹ گئی۔

۲۔ انگریزی کمپنی کے ابتدائی حالات

انگریزوں کی ابتدائی کوششیں

انگریز ملاحوں کو دسویں صدی ہجری کے بالکل شروع میں ہندوستان پہنچنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ فن جہاز رانی میں وہ پرتگیزوں کے محض مقلد نہیں بلکہ ابتدا سے ہمسری کے دعویدار تھے۔ اور گو نئے ممالک تک جہاز لیجانے میں سب سے بڑی کامیابیاں پرتگال اور ہسپانیہ کو نصیب ہوئیں لیکن انگریز بھی برابر اس دھن میں لگے رہے اور شمال مغربی راستے سے ایشیا پہنچنے کی کوشش میں جزیرہ نیوفونڈلینڈ سب سے پہلے انہی کے ملاحوں نے دریافت کیا۔ پھر دسویں صدی ہجری (سولھویں عیسوی) کے وسط میں اُن کے ایک بحری سردار نے یورپ و ایشیا کے شمال (یعنی بحر منجمد شمالی) کے راستے ممالک ایشیا تک پہنچنے کی کوشش کی اور خود اس سردار کے ہلاک ہونیکے باوجود اسکے بعض رفیق شمالی روس کے ساحل (بحر سفید) تک پہنچ گئے۔ یہاں سے وہ شاہ روس کے پائے تخت ماسکو آئے اور ممالک روس کے راستے ایران و بخارا سے تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اسیطرح اور کئی مرتبہ انگریز جہاز راں انہی شمالی راستوں سے ایشیا پہنچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی اور انگلستان کے جو چار سوداگر سب سے پہلے ہندوستان آئے وہ بھی بری راستوں سے یہاں تک پہنچے تھے (۱۵۸۳ء و ۱۵۸۴ء مطابق ۹۹۱ و ۹۹۲ھ) گوا کے پرتگیزوں نے انھیں پکڑ کر قید میں ڈال دیا لیکن آخر کار انھیں رہائی مل گئی اور ایک شخص بہت سی مشکلات برداشت کرنے کے بعد واپس اپنے وطن پہنچ گیا۔

بحری تجارت کا آغاز۔

لیکن انگریزوں کی ہندوستان سے تجارت کا اصلی آغاز اس وقت ہوا جبکہ ہسپانیہ اور پرتگال کی بحری قوت کم ہوگئی اور ہسپانیہ کے زبردست بیڑے (آرمیڈا) کی تباہی کے بعد انگریز سوداگروں نے ملکہ الزبتھ سے درخواست کی کہ ہمیں بھی ممالک ایشیا سے بحری تجارت کرنے کی اجازت دی جائے (۱۵۹۹ء مطابق ۹۹۹ھ) یہ درخواست منظور ہوئی اور اُن سوداگروں نے تین تجارتی جہاز ہندوستان روانہ کئے جن میں سے ایک راستے میں ڈوب گیا

وجنوبی ہند تک آئے اور یہی انگریزوں کے پہلے جہاز تھے جو افریقہ کے گرد پرتگیزوں کے دریافت کردہ راستے سے ایشیا پہنچے۔

آئندہ چند سال کی کوشش میں انگریزوں کو ہندوستان کی بحری تجارت میں چنداں نفع نہیں ہوا باایں ہمہ انکے شوق میں زیادتی ہوتی رہی اور آخر میں لندن کے کئی دولتمند سوداگروں نے تقریباً ۷ لاکھ روپے کے سرمایہ سے ایک کمپنی مرتب کی اور سولھویں صدی عیسوی کے آخری دن ملکہ الزبتھ نے بھی شاہی فرمان کی رو سے انکو ایشیا سے تجارت کی اجازت دے دی (۳۱ دسمبر سنہ ۱۶۰۰ء مطابق رجب سنہ ۱۰۰۹ھ) لیکن اول اول کمپنی زیادہ تر جزائر شرق الہند سے بیوپار کرتی رہی اور جب اس کے جہازیوں نے پرتگال والوں کی دیکھا دیکھی دیسی سوداگروں کے جہاز لوٹنے شروع کیئے تو ان جزیروں میں اسکی ساکھ بگڑ گئی اور تجارت میں نقصان ہوا۔[۵۱]

پرتگیزوں اور ولندیزوں کی رقابت

اس عرصے میں پرتگیزوں سے انگریزی کمپنی کی لڑائی شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے ان تجارتی رقیبوں کے خلاف ایرانیوں کو ملا لیا اور پرتگیزوں کی مقبوضہ بندرگاہ ہرمز (اورمز) سے انھیں خارج کر دیا (سنہ ۱۶۲۲ء مطابق سنہ ۱۰۳۱ھ) لیکن سواحل ہند پر اہل پرتگال نے بہت دن تک انگریزوں کے قدم نہ جمنے دیئے۔ اور درحقیقت یہ حکومت پرتگال کی اندرونی کمزوری کا نتیجہ تھا کہ وہ کرومول کے زمانے میں انگریزوں کی تجارت کا حق تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئی (سنہ ۱۶۵۴ء مطابق سنہ ۱۰۶۵ھ) دراصل انگریزوں نے جب ایشیائی سمندروں میں اپنے جہاز ڈالے اسوقت پرتگال کی بحری قوت میں زوال آ رہا تھا اور ہالینڈ والوں نے انھیں شکستیں دیکر اکثر ایشیائی مقامات سے نکال دیا تھا۔ لہذا انگریزوں کو پرتگیزوں سے اثر چھین کر اپنے واسطے جگہ نکال لینے میں اتنی دشواری نہ ہوئی جتنی کہ ولندیزوں اور دیگر یورپین رقیبوں کی مخالفت کی بدولت پیش آئی۔ ہالینڈ کی بحری قوت کا ان دنوں عروج تھا اور (سنہ ۱۶۰۹ء مطابق سنہ ۱۰۱۸ھ) میں اسپانیہ سے صلح ہو چکنے کے بعد اُسے اپنے دوسرے تجارتی رقیبوں سے لڑنے کی فرصت بھی مل گئی تھی۔ انگریزوں کے ساتھ ولندیزوں کے دوستانہ تعلقات تھے کیونکہ یہ دونوں قومیں اسی زمانے میں رومن کیتھولک مذہب چھوڑ کر پاپائے روم کی حکومت سے آزاد ہوئی تھیں، لیکن تجارتی اغراض نے بہت جلد اُن کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا اور سرکاری طور پر اعلان جنگ نہ ہونے کی حالت

---

[۵۱] کرمے ٹیٹر، جلد دوم صفحہ ۴۵۵

میں بھی ان کے تاجروں کے جہاز ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے۔ ولندیزیوں کی ابتدا میں کوشش یہ رہی کہ انگریز جزائر شرق الہند میں قدم جمانے نہ پائیں چنانچہ اُن کی جو تجارتی کوٹھیاں اُن جزیروں میں قائم تھیں اُن پر بارہا ولندیزی تاجروں نے حملے کیے اور جابجا انگریزوں کو نقصان پہنچایا۔ ۱۰۲۸ھ (مطابق ۱۶۱۹ء) میں دونوں قوموں کے تاجروں کی یورپ میں مصالحت بھی ہو گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے شریک رہ کر تجارت کریں لیکن اس عہد و پیمان کا ایشیا میں کوئی فائدہ ظاہر نہ ہوا اور تھوڑے ہی دن بعد مذکورہ جزائر کے دو مشہور انگریزی کارخانوں پر ولندیز جبراً قابض ہو گئے۔

زوامبوئے نا" کا قتل

ولندیزوں کی اس دشمنی کا سب سے مشہور واقعہ "امبوئے نا" کا قتل تھا یہ مقام جزائر ملایا میں واقع ہے اور یہاں ولندیزوں نے چند انگریز جہازیوں کو گرفتار کر کے اُن پر سازش و بغاوت کا الزام لگایا اور معمولی تحقیقات کے بعد سزائے قتل کا فیصلہ صادر کیا۔ تو انگریزوں کے ساتھ چند جاپانی اور ایک پرتگیز ملاح بھی شریک جرم قرار دیئے گئے تھے۔ مشہور ہے کہ ولندیزوں نے ان سب کو خوفناک اذیتیں دیں اور آخر قتل کرا دیا (۱۰۳۲ھ مطابق ۱۶۲۳ء) انگلستان میں اس واقعے کی اطلاع نے سخت غم و غصہ پیدا کر دیا تھا لیکن سالہا سال تک صرف خط و کتابت ہوتی رہی آخر کرومویل کے زمانے میں ہالینڈ کی حکومت نے ان مقتولوں کا خون بہا دلوانا قبول کیا۔

دربار مغلیہ میں سفارتیں

غرض بیس بائیس برس کی جد و جہد کے باوجود جزائر شرق الہند و ملایا میں تو انگریزی تجارت کوئی فروغ نہ پا سکی البتہ اس اثنا میں کپتان ہاکنس اور سر ٹامس رو کی سعی و سفارت سے انگریزوں کو سلطنت مغلیہ کے علاقوں میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی یا کم سے کم انھیں یہاں کے حکام سے روشناسی حاصل ہوئی اور سورت میں انکی تجارتی کوٹھی بھی قائم ہو گئی۔ ہاکنس جیمس اول شاہ انگلستان کا خط اور بہت سے تحائف لیکر عہد جہانگیری کے آغاز میں آگرے پہنچا تھا (۱۰۱۸ھ مطابق ۱۶۰۹ء) اور دو تین سال تک حاضر دربار رہا۔ اس کا بیان ہے کہ بادشاہ اسکے ساتھ بہت عنایت سے پیش آیا اور ترکی زبان میں بغیر ترجمان کے گفتگو کی نیز خلوت کے جلسوں میں بھی اُسے باریابی کا شرف بخشا اور چار صدی منصب عطا فرمایا۔ اسیطرح ٹامس رو جو تین سال بعد آیا بیان کرتا ہے کہ دربار مغلیہ میں اس کا بہت اعزاز و اکرام ہوا اور جہاں پناہ اسے اپنی بے تکلفی اور خلوت کے جلسوں میں شریک کرتے تھے لیکن درحقیقت ان انگریز سفیروں کے اقوال

سلہ اورکس ہن، صفحہ ۳۷۹ وغیرہ وغیرہ

کی صحت میں شبہ ہے۔ اس بات کا تو وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ جن تجارتی اغراض کیلئے وہ دربار میں آئے تھے، اُن میں چنداں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہاکنس کو اگر واقعی منصب چار صدی عنایت ہوا تھا تو وہ دربار کے سب سے کمتر امیروں کا منصب ہے اور سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ اُس عہد کی سرکاری تاریخوں میں اُن سفیروں کا کہیں نام تک نہیں آتا اور جیسا کہ ہم ایک حاشیے میں بیان کر چکے ہیں۔ فارسی تواریخ میں صرف بالواسطہ شہادتوں سے تامس رو اور اسکے انگریزی تحائف کے دربار میں پیش ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ حالانکہ دیگر ممالک کے سفیروں کی آمد کے تفصیلی حالات محفوظ ہیں، ویسے بھی سلاطین مغلیہ کے ذاتی مشاغل کی ایسی جزئیات فارسی تاریخوں میں قلمبند کی گئی ہیں کہ اگر ہاکنس یا تامس رو پر انکی خاص توجہ ہوتی تو یہ خلاف قیاس ہے کہ اُن کے ذکر سے یہ تاریخیں خالی ہوتیں۔

ابتدائی کارخانے

بہرحال سنہ ۱۰۲۱ھ مطابق (سنہ ۱۶۱۲ء) میں پہلی انگریزی کوٹھی سورت میں کھولی گئی اور بعد میں اسکی شاخیں برہانپور، احمد آباد، اجمیر، آگرہ میں قائم ہوئیں جو مغربی ہند میں اس زمانے کے بڑے بڑے تجارتی مرکز تھے۔ خود سورت غالباً اُس عہد میں ممالک ایشیا کی سب سے زیادہ آباد و بارونق بندرگاہ تھی اور جب یہاں پرتگیزوں کے علی الرغم انگریزی تجارت کی بنیاد پڑ گئی تو دوسرے مقامات پر بھی پرتگیز اپنے نووارد حریفوں کو فروغ پانے سے نہ روک سکے، اور کئی ناکامیوں کے بعد سنہ ۱۰۱۹ھ (مطابق ۱۶۱۱ء) میں کورومنڈل کے ساحل پر مچھلی پٹم اور پیٹھ پلی میں انگریزی دکانیں کھل گئیں۔ لیکن اس طرف انکی تجارت کے فروغ بلکہ کہنا چاہیے کہ حکومت کے آغاز کی تاریخ وہ ہے جب کہ چینا پٹم کے راجہ نے موجودہ مدراس کی زمین معاوضے پر بطریق معافی ایک انگریز ایجنٹ کو دے دی (سنہ ۱۰۴۹ھ مطابق سنہ ۱۶۳۹ء) اور تھوڑے دن بعد یہاں انکا قلعہ سینٹ جارج تعمیر ہوا (سنہ ۱۰۵۰ھ مطابق سنہ ۱۶۴۰ء)۔

واضح رہے کہ جنوبی ہند کے ان علاقوں میں اسوقت تک مغلوں کی عملداری نہ ہوئی تھی اور وجیانگر کے زوال نے یہاں کے مقامی رئیسوں کو خودمختار و آزاد بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چینا پٹم کا چھوٹا سا راجہ انگریزوں کو مدراس میں جنگی استحکام بنانے سے نہ روک سکا ورنہ مغلوں کے ملک میں جو اُن کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہوئیں وہاں وہ اس قسم کے قلعے بنانے کی جرأت نہ کر سکے اور انکی حیثیت خالص تاجرانہ رہی۔ اسی گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں بنگالے میں ان کے کئی کارخانے جاری ہوئے اور انگریزی تاریخوں کا بیان ہے کہ یہاں اُن کی تجارتی ترقی بہت

کچھ ڈاکٹر باؤٹن کے رسوخ و کوشش کا نتیجہ تھی جو بنگالے کے مغل صوبہ دار کی سرکار میں ملازم (جراح) تھا[1]۔

انگریز سوداگروں کا باہمی تنازعہ

لندن کے ان تاجروں کو اپنی وطنی حکومت کی طرف سے ایشیائی تجارت کا اجارہ مل گیا تھا لیکن شاہ چارلس اوّل کے زمانے میں بعض اور سوداگروں نے بھی تجارت کی اجازت حاصل کر لی اور اب دونوں کمپنیوں میں رقابت بلکہ کبھی کبھی جنگ و جدال ہونے لگی، ادھر انگلستان میں سخت خانہ جنگی برپا ہو گئی اور بہت دن تک حکومت درہم برہم رہی، آخر شاہ چارلس دوم کے زمانے میں ان سوداگروں میں باہم اتحاد ہو گیا اور از سر نو ایک فرمانِ شاہی حاصل ہوا جس کی رو سے نہ صرف تجارت، بلکہ اپنے ایشیائی مقبوضات میں انھیں ضرب سکّہ اور حکومت کرنے کے حقوق بھی مل گئے۔ (سنہ ۱۶۶۱ء مطابق سنہ ۱۰۷۱ھ)

کمپنی کا تجارتی فروغ۔

اسی سال چارلس نے جزیرہ بمبئی کمپنی کو کرائے پر دے دیا۔ اصل میں یہ جزیرہ پرتگیزوں کے قبضے میں تھا اور جب پرتگال کی شہزادی کی شاہ انگلستان سے شادی ہوئی تو یہ بھی اُسکے جہیز میں شاہِ انگلستان کو ملا تھا۔ اس جزیرے کی ان دنوں جو حیثیت و وقعت تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ لکھنا کافی ہے کہ اس کا سالانہ کرایہ صرف دس پونڈ قرار دیا گیا تھا لیکن اوّل تو اسی زمانے میں سورت پر مرہٹوں نے تاخت کی دوسرے آہستہ آہستہ جزیرہ بمبئی کی آبادی بڑھی اور انگریزوں کی چند عمارتیں تیار ہو گئیں۔ لہذا سنہ ۱۶۸۷ء (مطابق سنہ ۱۰۹۹ھ) میں کمپنی نے اپنے صدر دارالتجارت کو سورت سے بمبئی میں منتقل کر لیا اور اس وقت سے انگریزی تجارت کے ساتھ ساتھ اس جزیرے کی رونق و آبادی میں برابر ترقی ہوتی رہی۔

ملک گیری کے منصوبے اور ناکامیاں

یہی، بارھویں صدی ہجری کے آخری سنین کا زمانہ ہے جب انگریز سوداگروں کے دلوں میں شوق ملک گیری پیدا ہوا اور انھوں نے سر تامس رو کے سابقہ اصول عمل کو چھوڑ کر قرار دیا کہ آئندہ سے جہاں تک ممکن ہو کمپنی کے ملازمین اپنے تجارتی کارخانوں کو جنگی اغراض کے لئے مستحکم کریں اور فوجی مصارف اور منافع کے واسطے گرد و نواح کے علاقوں پر بھی تصرف حاصل کریں[2]۔ کمپنی کی طرف سے اس نئے منصوبے پر عمل کرنے کے واسطے جو ہدایات تحریر کی گئی تھیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک گیری کا یہ جذبہ ولندیزوں کی تقلید اور مزید منافع حاصل کرنے کے لالچ سے پیدا ہوا تھا۔ مگر جب اس پر عمل شروع ہوا تو کمپنی

[1] ترجمہ سیر جلد دوم صفحہ ۲۵
[2] کارخانہ کمپنی کی نئی تجاویز کے الفاظ یہ تھے کہ "آئندہ سے ہمیں نہ صرف تجارتی نفع بلکہ مالگزاری کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ

اور ہندوستان میں اس کے ملازمین کو سخت ناکامی و مصیبت اُٹھانی پڑی کیونکہ یہ ملک جزائر شرق الہند کی طرح جس میں ولندیزوں کا قبضہ ہوتا جاتا تھا نیم متمدن مقامی رئیسوں میں بٹے ہوئے ... تھے بلکہ مغلوں کی پرشوکت و منتظم مرکزی حکومت کے ماتحت تھے ؛

الغرض انگریزوں کی سرکشی کی خبر ہوتے ہی تمام صوبہ داروں کے نام شاہی احکام پہنچ گئے کہ ہر جگہ انکی دکانیں بند اور مال ضبط کرلیا جائے ۔ اسی ضمن میں کمپنی کے بعض انگریز ملازمین قید کرلئے گئے اور بعض نے روپوش ہوکر جان بچائی ، کمپنی اپنے زعم میں سلطنت مغلیہ سے برسرپیکار تھی ۔ لیکن یہاں اس کی طفلانہ "جنگ" کے حالات بیان کرنا تاریخ ہند کے ایک خفیف معاملے کو غیر معمولی اہمیت دینا ہوگا مختصر طور پر اتنا لکھنا کافی معلوم ہوتا ہے کہ گو کمپنی نے دو تین مرتبہ جنگی بیڑے روانہ کئے جن میں انگلستان کی شاہی فوج بھی تھی لیکن ان "حملہ آوروں" کی مجموعی تعداد غالباً دو ہزار سے کبھی زیادہ نہ تھی ، اور انھوں نے سواحل بنگال پر جو حملے کئے ان سب میں نقصان و ناکامی ہوئی ۔ پھر انھوں نے بحر عرب میں حاجیوں کے جہاز لوٹنے شروع کئے لیکن شاہی جہازوں نے اس دست برد کا بھی خاطر خواہ انسداد کردیا اور دو تین سال کی اس "لڑائی" میں اہل ہند کا تو کوئی قابل ذکر ملکی یا مالی نقصان ہوا نہیں البتہ کمپنی کا دیوالا نکلنے کی نوبت پہنچی ۔ آخر اُس کے وکیلوں نے عجز و ندامت کے ساتھ بادشاہ سے معافی مانگی تب اُسے از سر نو مگر دشوار تر شرائط پر تجارت کی اجازت حاصل ہوئی (سنہ ۱۱۰۲ھ مطابق سنہ ۱۶۹۰ء) نیز اُسی سال انھیں کلکتے کے مقام پر زمین لے کر تجارتی کارخانہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی ! باایں ہمہ کمپنی کی اسی ایک جنگ نے اُس کو ایسا نقصان پہنچایا اور سبق دیا تھا کہ پھر نصف صدی تک انگریزوں کو "ملک گیری" کا حوصلہ نہ ہوا اور بعد میں بھی یہ صرف فرانسیسیوں سے تجارتی رقابت و آویزش کا نتیجہ تھا کہ وہ دوبارہ ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دخل دینے پر آمادہ ہوئے ؛

نئی کمپنی اور اس کا اتحاد

معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے مذکورۂ بالا نقصانات اور ناکامیوں نے وطن میں بھی اُس کی ساکھ

بقیہ حاشیہ صفحہ (۴۱) اگر تجارت میں خسارہ ہو تو بھی اپنی "سپاہ" کے مصارف ادا کرسکیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہی وہ مصلحت ہے جس کی بناء پر دانشمند ولندیز اپنی عام ہدایات میں جنھیں ہم نے دیکھا ہے ، اگر ایک فقرہ اپنی تجارت کے متعلق لکھتے ہیں تو دس فقرے سیاسی اور جنگی معاملات اور اپنی مالگزاری بڑھانے کے متعلق تحریر کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "گزٹیئر جلد دوم صفحہ (۲۶۰)

بگاڑ دی اور وہاں کا "آزاد خیال" (وہگ) فرقہ اس کے تجارتی اجارے کے خلاف ہوگیا۔ اس اجارے کے باوجود بعض سوداگر چوری چھپے بنج کی تجارت تو پہلے بھی کرتے تھے لیکن اب جو کمپنی والوں نے بعض عہدہ داروں کو دریا دلی سے رشوتیں دے کر پارلیمنٹ کے بے اطلاع ایک تازہ فرمانِ شاہی حاصل کرلیا تو پارلیمنٹ میں عام ناراضی پیدا ہوگئی۔ اور دارالعوام نے ایک تجویز منظور کی جس کی رو سے انگلستان کے ہر شخص کو ایشیا سے تجارت کا حق مل گیا اور کمپنی کے مخصوص حقوق سوخت کر لئے گئے (سنہ ۱۶۹۴ء مطابق سنہ ۱۱۰۶ھ)

نئی انگلش کمپنی

پرانی کمپنی کے توڑ پر ایک نئی "انگلش کمپنی" قائم ہوئی جس میں بہت سے دولتمند اور ذی اثر لوگ حصہ دار تھے۔ اس کمپنی کے مقرر کردہ ملازمین کی پرانی کمپنی کے نوکروں سے ہندوستان میں بہت دن تک جنگِ زرگری ہوتی رہی مگر نئی کمپنی کو انگلستان میں جو رسوخ و اثر حاصل ہوگیا تھا ہندوستان میں حاصل نہ ہوسکا اور آخر عرصہ دراز کے بے لطف تنازعات اور طویل بحث مباحثے کے بعد حکومت انگلستان نے دونوں کمپنیوں کو متحد کردیا (سنہ ۱۷۰۸ء مطابق سنہ ۱۱۱۹ھ) اور یہی "ایشیا سے تجارت کرنے والے سوداگروں کی متحدہ جماعت" تھی[۱] جس سے بعد میں اہل ہند کو نہ صرف تجارتی بلکہ سیاسی واسطہ پڑا۔

مذکورۂ بالا اندرونی نزاع رفع ہونے کے بعد ان انگریز تاجروں کو پہلے سے زیادہ بہتر طور اور اطمینان کے ساتھ اپنی تجارت ہند کو ترقی دینے کا موقع ملا لیکن اورنگ زیب کے عہد میں مغلوں سے لڑائی چھیڑ کر وہ ایسا نقصان اٹھا چکے تھے کہ اب اُن کے تمام سیاسی منصوبے اور ملکی فتوحات کی آرزوئیں دلوں سے محو ہوگئی تھیں اور آئندہ چالیس برس تک انھوں نے ہندوستان کے معاملات میں حصہ لینے کی جسارت نہ کی۔ گزیٹیر کے مختصر تبصرے میں کمپنی کی اس چہل سالہ تاریخ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "اب کمپنی نے اسی قدیم طرزِ عمل کو اختیار کرلیا تھا کہ چپ چاپ اپنے بیوپار سے کام رکھے لہٰذا اس کی تاریخ میں یہ زمانہ قابلِ ذکر واقعات سے خالی ہے"۔ سنہ ۱۷۱۵ء سے سنہ ۱۷۱۷ء (مطابق سنہ ۱۱۳۰ھ) تک ایک انگریز ایلچی سورمان دربار شاہی میں رہا اور اس نے سلطنت مغلیہ کی طرف سے کمپنی کے لئے بعض تجارتی فرمان

---

[۱] "United Company of Merchants of England, trading to the East"

نوآبادیاں بسانے کی مراعات حاصل کیں اور کمپنی کے ملازمین کو اپنی آنکھوں سے سلطنت کی اندرونی خرابی دیکھنے کا بھی موقع ملا لیکن اس عرصے میں خود کمپنی نے اپنے کام سے کام رکھا۔۔۔ بدامنی سے جو خرابیاں ملک میں رونما ہو رہی تھیں اُن کے سب سے بڑے اثرات بمبئی میں ظاہر ہوئے جہاں ایک طرف انگریا نامی بحری قزاق ساحلوں پر کمپنی کی تجارت میں خلل ڈال رہا تھا اور دوسری طرف مرہٹوں کی آمد آمد نے کمپنی کی سلامتی کو مخدوش کر دیا تھا لیکن بنگالے کا نیم آزاد نواب اپنے انگریز ہمسایوں کے ساتھ مصالحانہ برتاؤ کرتا رہا اور مدراس میں انگریزوں کو اطمینان تھا کہ جب تک نواب نظام الملک اور مرہٹوں میں فیصلہ نہ ہو جائے، اس وقت تک وہ محفوظ ہیں بایں ہمہ ۱۷۴۲ء (مطابق ۱۱۵۵ھ) کے قریب ہم دیکھتے ہیں کہ کمپنی کے تینوں مرکزی کارخانوں تک مرہٹوں کا دستِ تصرف دراز ہو رہا ہے۔۔۔ یعنی اس سال ادھر تو مرہٹوں کا کرناٹک پر حملہ ہوتا ہے اور اُدھر دو سال بعد انگریزوں کو کلکتے کی حفاظت کے لیے مجبوراً خندق کھودنی پڑتی ہے۔" (جلد دوم صفحہ ۶۳)

۳۔ انگریزوں کا غلبہ فرانسیسیوں پر

پرتگیزوں کے زوالِ قوت کا حال اوپر ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ اندرونی قومی خرابیوں کے علاوہ ولندیزیوں کی دشمنی سے اُن کو سخت نقصان پہنچا لیکن خود ولندیز ہندوستان میں پرتگیزوں کی جگہ نہ لے سکے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اُن کی چھوٹی سی ریاست کی حریف ہمسایہ پڑوسی فرانس اور انگلستان جیسی قوی ریاستیں تھیں دوسرے یہ کہ ایشیا میں اُن کی آمد و عروج کے وقت مغلوں کی زبردست سلطنت قائم تھی ہندوستان میں ملک گیری کا موقع نہ تھا اور چونکہ ولندیز اب کسی ملک پر مستقل قبضہ کیے بغیر وہاں تجارت کرنی پسند نہ کرتے تھے لہٰذا انہیں ہندوستان کے بجائے اپنے مستقر جزائر شرق الہند و ملایا میں بنانے پڑے جہاں اُن کی کشورکشائی کو روکنے والی کوئی بڑی مقامی ریاست نہ تھی۔ خام اجناس خاص کر مسالحوں کی ان جزائر میں افراط تھی جس کی بدولت ولندیزوں کو وہاں کی تجارت و زراعت میں نفع بھی خوب ہوا اور انھوں نے یہاں ایسی مضبوطی سے قدم جمائے کہ اس مجمع الجزائر کے کئی بڑے بڑے جزیرے اب تک یورپ کی اسی چھوٹی سی قوم کے قبضے میں ہیں۔

اول اول انگریزی سوداگروں نے بھی بجائے ہندوستان کے ان جزائر میں اپنا بیوپار پھیلانے کی سعی کی تھی لیکن ولندیزوں کی رقابت اور قوت نے اُن کا یہاں زیادہ دخل نہ ہونے دیا

اور ناچار انھوں نے سواحلِ ہند ہی پر اپنے مرکزی کارخانے بنائے۔ بے شبہ ان انگریز تاجروں کو بھی ولندیزیوں کی طرح ملک گیری کا سودا تھا اور جیسا کہ ہم ابھی بیان کر رہے تھے انھوں نے گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں ہندوستان کے بعض مقامات پر آزادانہ قبضہ کرنے کی ٹھان لی تھی لیکن جب اس کوشش میں نقصان ہوا تو انگریزی کمپنی نے اپنا طرزِ عمل بدل دیا اور دوبارہ صرف تجارت کو اپنا مقصود قرار دیا۔ یہ کمپنی اب اپنے سیاسی منصوبوں کو بالکل ترک کر چکی تھی مگر تقدیر نے انگریزوں کو ہندوستان کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا تھا لہذا ان کی تجارت کے فروغ کے ساتھ ہندوستان سے اُن کا تعلق بھی قوی ہوتا گیا پھر اسی تجارت کی حفاظت کی خاطر نیز دیگر اسباب نے جب اُن کو اپنے فرانسیسی حریفوں سے آمادۂ پیکار کیا تو گویا وہ بلاقصد دوبارہ سیاسیاتِ ہند کے میدان میں داخل ہوئے۔

فرانسیسی کمپنی اور ہند میں

جہاں تک جہازرانی کا تعلق ہے۔ فرانسیسی ملاح بہت پہلے (دسویں صدی ہجری سے کے آغاز ہی میں ایشیائی سمندروں تک پہنچ گئے تھے اور یکے بعد دیگرے فرانس میں کئی کمپنیاں بھی بنیں جن کا مقصد ممالکِ ایشیا سے تجارت کرنا تھا لیکن اہلِ فرانس اُن دنوں سپہگری کے دلدادہ تھے تجارت سے انھیں چنداں مناسبت نہ تھی۔ ان کمپنیوں کو ملک میں کوئی قبولیت نہ حاصل ہوئی اور وہ تھوڑے تھوڑے دن بعد بند ہو گئیں لیکن گیارھویں صدی ہجری (سترھویں عیسوی) کے وسط میں خود حکومت فرانس مشرقی ممالک سے تعلقات بڑھانے میں کوشاں ہوئی اور شاہ لوئی چہاردہم کے عہد اور اس کے وزیر کولبیر کی سرپرستی میں سوداگروں کی ایک جماعت مرتب ہوئی جس کا مقصود ممالکِ ہند سے تجارت کرنا تھا (۱۰۷۴ھ مطابق ۱۶۶۴ء) اس کمپنی کا پہلا تجارتی کارخانہ چار سال بعد سورت میں قائم ہوا اور اگلے سال مچھلی پٹم میں ایک شاخ کھل گئی۔ لیکن اسی زمانے میں فرانس کی ہالینڈ سے جنگ شروع ہوئی اور اس کی چنگاریوں سے ان قوموں کے ہندوستانی کارخانے بھی محفوظ نہ رہے۔ کم سے کم تجارت کو سخت نقصان پہنچا اور میلاپور (مدراس) کے ولندیزی کارخانے پر جن فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا تھا انھیں ولندیزیوں نے شاہ گولکنڈہ کی مدد سے جبراً خارج کر دیا۔ (۱۰۸۵ھ مطابق ۱۶۷۴ء)

پانڈیچری کی بنا۔

یہاں سے نکل کر یہ فرانسیسی کوئی سو میل جنوب میں ساحل کورومنڈل کے اس مقام پر اترے جو تھوڑے دن پہلے انھوں نے سلطنت بیجاپور کے صوبہ دار شیر خاں لودی سے خرید لیا تھا۔ یہ قطعہ زمین بیجاپور کے صوبۂ جنجی میں اسی نام کی ندی کے کنارے تھا اور یہیں آ کر فرانسیسی

نے شیر خاں کی اجازت و امداد سے وہ بستی بسائی جو "پھلچیری" کہلاتی تھی اور بعد میں "پان ڈی چیری" (پان ڈی شیری) کے نام سے مشہور ہوئی۔ شیر خاں صوبہ دار کی راست بازی اور شرافت کے فرانسیسی مورخ بہت مداح ہیں اور اُسی نے بعد میں اُن کے آباد کاروں کو قریب کی زمینیں بھی بطور جاگیر عطا کر دی تھیں۔ اس طرح ولندیزوں کی دشمنی کے باوجود یہ چھوٹی سی فرانسیسی بستی آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگی اور ۱۱۱۸ھ (مطابق ۱۷۰۶ء) میں جب اس کا لائق بانی فوت ہوا، تو وہ ایک بڑا تجارتی اور جنگی شہر بن گئی تھی[۱]

جب جنوبی ہند میں دولتمند فرانسیسی تاجروں کا ایسا باموقع صدر مقام بن گیا تو لازمی طور پر ان اقطاع کے مقامی رئیسوں سے بھی ان کی شناسائی ہو گئی لیکن محمد شاہ کے عہد یعنی بارہویں صدی ہجری کے وسط تک اُن کا اہل ہند سے تعلق خالص تجارتی تھا اور دوسرے فرنگی سوداگروں کی طرح وہ بھی لین دین اور بیوپار کے سوا دیگر ملکی معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے، مگر ۱۱۴۸ھ (مطابق ۱۷۳۵ء) میں جب ڈیوما (Dumas) اُن کا صدر عامل یا گورنر مقرر ہوا تو اُن کا یہ طرز عمل بدل گیا اور سچ یہ ہے کہ خود ہندی رئیسوں کے باہمی نفاق اور خود غرضی نے فرانسیسیوں کو اُن کے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع دیا ورنہ محتاط ڈیوما خود ان جھگڑوں اور جوکھوں میں پڑنا نہ چاہتا تھا کہ مبادا فرانسیسی سوداگروں کی شہرت کو بٹہ لگے اور اہل ہند کی بدگمانی اُن کو نقصان پہنچائے[۲]

بہر حال پہلی مرتبہ انھوں نے ۱۱۵۱ھ (مطابق ۱۷۳۹ء) میں تنجور کی مسند نشینی کے جھگڑے میں حصہ لیا اور اپنی مدد کے بدلے میں قصبۂ کاری کال حاصل کیا جو کول رون ندی کے دہانے پر واقع ہے اور اُن دنوں نہایت باموقع تجارتی بندرگاہ سمجھا جاتا تھا۔ تنجور ایک چھوٹی سی ہندو ریاست تھی اور فرانسیسیوں کو اس کے اندرونی تنازعہ میں شریک ہونے سے کچھ تکلیف برداشت | فرانسیسی مداخلت ملکی معاملات میں

[۱] فرانسیسیوں کے ان حالات کا خاص ماخذ۔ میلیسن کی کتاب "ہسٹری آف دی فرنچ ان انڈیا" ہے۔ دیکھو صفحات ۲۰ تا ۲۶۔

[۲] بعض انگریزی تاریخوں میں لکھا ہے کہ خود ڈیوما نے ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دخل دینے کا منصوبہ بنایا تھا اور گزسے ٹیر میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے لیکن یہ قول واقعات کے خلاف غلط فہمی پیدا کرنیوالا ہے اور ہماری مذکورہ بالا رائے تفصیلی واقعات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میلیسن کی رائے کے موافق ہے (دیکھو ہسٹری آف دی فرنچ۔ باب سوم)

کرنی نہ پڑی۔ اور اس کا توقع سے بڑھکر قیمتی معاوضہ حاصل ہوگیا لیکن اسی ابتدا نے اُن کو آخر کرناٹک اور دکن کی سیاسی پیچیدگیوں میں پھنسایا اور آئندہ اُن کی جلد بازی اور بیجا ہوس ملک گیری خود اُن کے حق میں ناسازگار ثابت ہوئی ؁

دراصل جب تک دوراندیش **ڈیوما** فرانسیسیوں کا حاکم رہا۔ اسوقت تک اُنکی شہرت وقوت برابر بڑھتی رہی اور اُس نے مرہٹوں کی یورش کرناٹک کے زمانے میں یہاں کے مقامی رئیسوں کی اعانت کی تو بھی فرانسیسیوں کی حیثیت محض احسانمند ہمدردوں کی سی تھی اور دوست علی رئیس کرناٹک کے اہل وعیال کو مصیبت کے وقت **پانڈیچیری** میں پناہ دینا بھی محض ان احسانات کا معاوضہ سمجھا جاسکتا ہے جو اس خاندان نے غریب الوطن فرانسیسی سوداگروں کے ساتھ کیئے تھے لیکن مرہٹہ حملہ آوروں کے مقابلے میں اس پناہ دہی نے ادھر تو رئیس کرناٹک کے خاندان کو فرانسیسیوں کا ممنونِ احسان بنالیا اور اُدھر اُنکی جنگی قوت اور جرأت کا دکن میں ایسا شہرہ ہوگیا کہ خود نواب نظام الملک آصفجاہ اوّل نے ڈیوما کو خلعت بھیجا اور کچھ روز بعد دربارِ دہلی سے بھی اُسے منصب اور نوابی کا خطاب ملا[۱]۔ یہ ۱۱۵۳ و ۱۱۵۴ھ (مطابق ۱۷۴۱ء) کے واقعات ہیں، اور چونکہ **ڈیوما** اسی زمانے میں اپنی ملازمت سے دستکش ہوگیا تھا۔ لہٰذا اُس کی حاصل کردہ عزت وقوت سے فائدہ اٹھانے کا موقع اس کے مشہور جانشین **ڈوپلے** کو ملا جو پہلے چندرنگر کے فرانسیسی کارخانے کا منتظم تھا اور اب **پانڈیچیری** کا صدر عامل یا گورنر مقرر ہوا ؁ (۱۷۴۱ء)

ڈوپلے

ڈوپلے کی اکثر انگریز موّرخوں نے سخت مذمت کی ہے کہ وہ ذاتی طور پر مکار و بداخلاق آدمی تھا لیکن حال میں جب سے اہل فرانس کے ساتھ انگریزوں کی قدیم رقابت اور دشمنی میں فرق آیا ہے اس مذمت میں بھی کمی آگئی ہے اور اب ڈوپلے کی سازش وجعل سازی کی تاویل شروع ہوگئی ہے۔ خود اہل فرانس اب ڈوپلے کو اپنے محسنینِ قوم کی فہرست میں داخل کرتے ہیں حالانکہ زندگی میں اُنھوں نے بڑی ذلت وخواری کے ساتھ اُسے معزول کیا تھا۔ اس تغیر رائے کی ایک خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آجکل یورپ میں قومی فوائد کیلئے مکر وفریب کو بھی جائز سمجھا جانے لگا ہے پس ڈوپلے نے اگر ہندوستان میں کوئی سازش یا جعلسازی کی تو صرف اتنا ثابت کردینا

[۱] مے لیسن ہسٹری اوف دی فرنیچ"

ان جرائم کو محاسن کی شکل میں بدل دیگا۔ کہ یہ کام اُس نے فرانس کو فائدہ پہنچانے کی نیت سے کیئے تھے۔ لیکن ذاتی اخلاق سے قطع نظر ہمیں یہاں خاص طور پر جو بات یاد رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ دوپلے کی ناکامی کا اصلی سبب یہ ہوا کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کے کام کرنا چاہتا تھا اور جلد بازی سے جو اہل فرانس کی قومی خصائص میں داخل ہے۔ تمام ممالک دکن کو چند ہی سال میں دبا لینے کا آرزومند تھا حالانکہ اہل ہند کو اندرونی خرابیوں نے خواہ کتنا ہی کمزور کر دیا ہو۔ مگر اُسوقت یورپ والوں میں اتنی قوت نہ تھی کہ اتنی وسیع مملکت کو آسانی سے ہضم کر جائیں۔

انگریزوں سے پہلی جنگ

بہرحال، دوپلے کو ہندوستانی معاملات میں کوئی خاص دخل دینے کا ابھی موقع نہ ملا تھا کہ سنہ ۱۷۴۴ء (مطابق سنہ ۱۱۵۷ھ) میں فرانس و انگلستان کی جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان میں بھی خود انگریزوں نے پیش دستی کی یعنی پانڈی چیری پر بحری حملہ کیا۔ اُن کی اس جرأت کا اصلی سبب یہ تھا کہ اُس وقت اہل فرانس کا کوئی جنگی بیڑا ایشیائی سمندروں میں موجود نہ تھا اور اہل انگلستان لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی ایک بیڑا خاص اس واسطے روانہ کر چکے تھے کہ فرانس کی ایشیائی تجارت اور نوآبادیوں کو غارت کر دیا جائے۔

اہل فرانس کی غفلت سے انگریزوں کو پانڈی چیری کی فتح کا موقع تو بہت اچھا مل گیا تھا لیکن اب کرناٹک، بیجاپور و گولکنڈے کے نام کی بادشاہوں کے تحت میں نہ تھا اور نہ وہاں دوست علی کے زمانے کی سی بدعملی تھی کیونکہ اسی زمانے میں نواب نظام الملک آصف جاہ اول نے از سر نو اس علاقے کا انتظام درست کیا اور وہاں اپنے ایک سردار انورالدین خاں کو ناظم بنا دیا تھا جیسا کہ پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ انورالدین نہایت مستعد اور لائق حاکم تھا اور جب اس موقع پر دوپلے نے اس کے حضور میں انگریزوں کی زیادتی کی فریاد کی تو اس نے مدراس حکم بھیجا کہ خبردار انگریزوں کو پانڈی چیری پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ اُس کے تھوڑے ہی دنوں بعد لابوردونے ایک فرانسیسی بیڑا ہندوستان آ پہنچا اور اب خود دوپلے نے مدراس پر فوج کشی کی اور انورالدین خاں نے اس فوج کشی کی اجازت اس شرط پر دی کہ فرانسیسی اس شہر کو تسخیر کرنے کے بعد نواب موصوف کے حوالے کر دیں گے۔

۱؎ ملیسن۔ ۹۹-۱۰۰

سنہ ۱۷۴۶ء (اواخر سنہ ۱۱۵۹ھ) میں فرانسیسیوں نے مدراس فتح کرلیا لیکن اس پر قابض ہونیکے بعد اُن کے سرداروں میں باہم نزاع ہوگئی اور اسی جھگڑے کی وجہ سے شہر کا نواب انورالدین خاں کے حوالے کرنا ملتوی رہا۔ اور نواب نے جو فوج اس امید پر مدراس روانہ کی تھی کہ حسب اقرار فرانسیسی اس شہر کو خالی کردیں گے، اس فوج پر فرانسیسیوں نے غالبًا دھوکے سے[51] حملہ کیا اور شکست دی، ساتھ ہی ڈوپلے نے مدراس کو مستقل طور پر فرانسیسی مقبوضہ بنانے کا اعلان کردیا

مذکورۂ بالا جنگ "مدراس" کے چند ہی میل جنوب میں موضع میلاپور کے قریب واقع ہوئی تھی، یورپین راویوں کا بیان ہے کہ اس میں نواب کی فوج تقریبًا دس ہزار تھی اور مقابلے میں پان ڈی چیری اور مدراس کے فرانسیسی سپاہیوں کی تعداد کم و بیش دو ہزار بتائی گئی ہے جن میں سے اصلی اور پہلا حملہ کرنے والے ایک ہزار سے بھی کم تھے بلکہ اس فتح میں تعریف کا اصلی حقدار اگر فرنگی سپاہیوں کو سمجھا جائے تو ان کی تعداد اس سے بھی کم یعنی دو سو تیس کے قریب تھی[52]، انہی "بہادروں" کے حملے کی دشمن تاب نہ لایا اور طرفۃ العین میں بے حواس ہوکر فرار ہوگیا، پس مے لیسن صاحب دعوے کرتے ہیں کہ تاریخ ہندوستان کی جس قدر بڑی بڑی لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں سے اس میلاپور کے معرکے سے زیادہ کوئی بھی یادگار کے قابل نہیں، پھر وہ اور قریب قریب تمام انگریز تاریخ نویس یقین دلاتے ہیں کہ یہی ایک معرکہ اس بات کا قطعی اور پہلا ثبوت تھا کہ ایک مٹھی بھر قواعد داں اور بہادر فرنگی سپاہ کے مقابلے میں ہندوستانیوں کے بڑے سے بڑے لشکر کی کچھ حقیقت نہیں ہے، لیکن اس سے قطع نظر کہ ان "فرنگی افواج" میں ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد فرنگیوں کی نسبت ہمیشہ سے کئی چہار گنی رہی ہے، یہ فرنگی مورخ خودستائی کے جوش میں اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ میلاپور کی لڑائی کو پورا ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ نواب انورالدین خاں کے اسی بے قاعدہ لشکر نے فرانسیسیوں کو کدلور کے قریب شکست دی اور یہ قواعد داں بہادر اس طرح فرار ہوئے کہ دو گھنٹے تک انھوں نے کہیں ٹھیرنے کا نام نہیں لیا[53] (۹ دسمبر سنہ ۱۷۴۶ء)، پھر جب ہم پڑھتے ہیں کہ ڈوپلے کو آخر میں نواب سے اس شرط پر صلح کرنی پڑی کہ مدراس کے جنگی مورچے منہدم

[51] اس لڑائی کا ہماری کسی فارسی تاریخ میں ذکر نہیں اور فرانسیسیوں کے بیانات کا خلاصہ مے لیسن صاحب نیز دیگر انگریز تاریخ نگاروں نے بیان کیا ہے اس کا طرز تاریخ کے بجائے خیالی داستانوں سے ملتا جلتا ہے مگر دوسرا ماخذ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں چار و ناچار قیاس و درایت کے زور سے انہی مبالغہ آمیز روایات میں سے اصلی واقعات کا سراغ لگانا پڑے گا۔

[52] ہسٹری اوف دی فرنچ، صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۳

[53] ہسٹری اوف دی فرنچ صفحہ ۱۲۳ تا ۲

لڑا دیئے جائیں گے تو معاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ انورالدین خاں کا اصلی مقصود پورا ہو گیا۔
اسی ضمن میں یہ جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناظم کرناٹک کی دس ہزار فوج کے مقابلے میں فرانسیسی سپاہ کی جو تعداد (دو ہزار) بتائی گئی ہے وہ کسی قدر مشتبہ ہے کیونکہ اگرچہ برس پہلے، پانڈی چیری میں ضرورت کے وقت پانچ ہزار قواعد داں ہندوستانی اور ایک ہزار سے زیادہ فرنگی سپاہی بھرتی ہو سکتے تھے[۱] تو سمجھ میں نہیں آتا کہ دوپلے کے زمانے میں انکی تعداد اتنی کم کیوں تھی۔ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ وہ اپنے محتاط پیش رو سے کہیں زیادہ پرجوش و خودنما تھا اور اس جنگ کے موقع پر روپیہ بھی زیادہ صرف کر سکتا تھا؟

بہرحال انگریز اور فرانسیسیوں کی یہ لڑائی یورپ سے شروع ہوئی تھی اور وہیں ختم ہوئی، (عہد نامہ ایکس لاشاپیل، مرتبہ سنہ ۱۱۶۲ھ مطابق سنہ ۱۷۴۸ء) لیکن دو برس بعد ان کے باہم جو جنگ ہندوستان میں چھڑی وہ محض مقامی تھی یعنی حکومت فرانس و انگلستان کا اس میں کوئی جھگڑا نہ تھا بلکہ ابتداءً یہ صرف ان قوموں کے تاجروں کی جنگ تھی (سنہ ۱۷۴۴ء تا سنہ ۱۷۵۴ء مطابق سنہ ۱۱۶۷ھ)

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ نواب نظام الملک آصف جاہ اوّل کی وفات کے بعد مرحوم کے ایک نواسے (ہدایت محی الدین خاں عرف مظفر جنگ) کو بھی مسند دکن کا دعویٰ تھا اسی طرح کرناٹک کی نظامت کا حسین دوست خاں عرف چندا صاحب مدعی بن گیا جو یہاں کے پہلے رئیس صفدر علی کا داماد تھا اور ان دونوں کی پشت پناہی ڈوپلے نے اپنے ذمے لی۔ لیکن فرانسیسیوں کو مظفر جنگ کی رفاقت میں علانیہ دکن پر فوج کشی کی ہمت نہ تھی اور یوں بھی کرناٹک زیادہ قریب تھا لہٰذا اوّل اوّل انھوں نے چندا صاحب کی اعانت پر اکتفا کی۔
تقدیر کی یاوری سے پہلی ہی لڑائی میں نواب انورالدین خاں مارا گیا (جنگ امبر ۱۷۴۹ء مطابق ۱۱۶۲ھ) اور اہل سازش ملک پر قابض ہو گئے لیکن اس بغاوت کا حال سن کر نواب ناصر جنگ نے جب ادھر رخ کیا تو اتحادیوں نے پانڈی چیری کی جانب فرار اختیار کیا اور نواب ناصر جنگ نے یہاں تک بھی ان کا تعاقب نہ چھوڑا۔ شہر سے کچھ فاصلے پر فرانسیسیوں نے بہت مستحکم مورچے اور دمدمے بنا لیئے تھے لیکن فرانسیسی سپاہی نواب ناصر جنگ کے زبردست لشکر کی آمد دیکھ کر گھبرا گئے۔ معمولی زد و خورد ہی میں ان کی شجاعت اور قواعد دانی کی قلعی کھل گئی اور وہ راتوں رات

---

[۱] لے لیسن، کتاب مذکور صفحہ ۸۵،

اپنے مورچوں سے چھپ کر بھاگ گئے۔ یورپی راویوں کا قول ہے کہ مظفر جنگ کو بھی انھوں نے اپنے ساتھ پانڈی چیری میں جاکر پناہ لینے کی صلاح دی تھی لیکن اس نے خود انکار کر دیا، اور دوسرے دن ماموں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔[1] (شوال ۱۱۶۳ھ مطابق ستمبر ۱۷۵۰ء)

نواب ناصر جنگ اور پھر مظفر جنگ کے قتل اور فرانسیسیوں کے دربار دکن میں رسوخ حاصل کرنے کے حالات گذشتہ باب میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں، انگریزوں نے اب تک ان سازشوں اور لڑائیوں میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا لیکن دربار دکن میں فرانسیسیوں کا روز افزوں رسوخ دیکھکر انھیں سخت وہم و حسد پیدا ہوا اور بقول صاحب ماثر الامرا "ہوائے مداخلت در ملک بادشاہی بہم رسید کہ آلو آلوہا ویدہ رشک میگیرد" چونکہ دکن تک رسائی دشوار تھی، لہٰذا ان کی کوشش کرناٹک تک محدود رہی اور وہ نواب محمد علی خاں کے حلیف و مددگار بن گئے۔ یہ شخص نواب انور الدین خاں کا چھوٹا بیٹا اور بہ اعتبار وراثت نظامت کرناٹک کا حقدار تھا، مگر چندا صاحب نے اُسے اب شمالی کرناٹک سے دھکیل کر ترچناپلی میں محصور کر رکھا تھا (۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۵۱ء) اور ابتدا میں انگریز بھی اُس کو بچانے سے مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن اس مہم کو جلد سے جلد فیصل کرنے کی دُھن میں چندا صاحب نے اپنی تمام فوج اسی شہر (ترچناپلی) کے گرد جمع کر لی تھی اور خود اپنے صدر مقام ارکاٹ کو غیر محفوظ چھوڑ آیا تھا، اتفاق سے انہی دنوں تازہ دم فوج انگلستان سے مدراس آئی اور چونکہ اسے ترچناپلی میں جانا دشوار و بیکار نظر آتا تھا لہٰذا کلائیو کو ارکاٹ پر حملہ کرنے کی تدبیر سوجھی اور انگریزوں نے یک بیک پہنچکر بلا مزاحمت اس قلعے پر قبضہ کر لیا۔

محمد علی کی کامیابی

قرینہ کہتا ہے کہ چندا صاحب کو اس بات کا گمان نہ تھا کہ مدراس کے انگریز تاجر بطور خود اس کے ملک پر حملہ کرنے کی جرأت کریں گے لیکن اس واقعے نے لڑائی کا رنگ بدل دیا اور چندا صاحب کو ترچناپلی کے محاصرے کے ساتھ اپنا صدر مقام واپس لینے کی فکر لاحق ہو گئی۔ اسی وقت فرانسیسیوں کو بھی غالباً اپنی ہوس بیجا کے برے

[1] میلیسن صفحہ ۲۴۹ وغیرہ۔ مگر یہ روایتیں بناوٹ سے خالی نہیں۔ صاحب ماثر الامرا نے اسی واقعے کو مختصر طور پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "بست و ششم ربیع الآخر ۱۱۶۳ھ تا سہ پاس کامل آتش خانۂ فرنگ سرگرم اشتعال بود۔ (آخر پہر در تاریخ) بست و ہفتم مذ فرنگیاں از رعب و مہابت محمدیاں رو بہ ہزیمت آوردند و ہدایت محی الدین زندہ دست گیر شد" جلد سوم صفحہ ۴۵۳

نتائج اور یہ بات معلوم ہو چکی ہوگی کہ اُن کا جنوبی ہندوستان میں فروغ محض مکر و سازش کی اتفاقی کامیابی سے تھا ورنہ خود ان میں اس قدر قوت نہ تھی کہ وہ حیدرآباد ایک طرف، صرف کرناٹک ہی کو اپنے قابو میں رکھ سکتے۔ کیونکہ محمد علی کی وجاہت، و شورش پسندی نے بہت سے ہندی رئیسوں کو اس کی اعانت پر آمادہ کر دیا اور آئندہ سال خود چندا صاحب پکڑ کر گرفتار و قتل ہوا تو فرانسیسی بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گئے اور کرناٹک میں نواب محمد علی کا کوئی حریف نہ رہا انگریزوں کو بھی محمد علی کے جیتے جی ملک میں مداخلت کرنے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا[١]، تاہم متعدد و مشہور معرکوں کے علاوہ یہی جیت کیا کم تھی کہ فرانسیسیوں کا کرناٹک میں کوئی اثر نہ رہا، اور وہ ہندوستان میں پانڈی چیری کی بھی خاطر خواہ مدافعت نہ کر سکے ؎

فرانسیسیوں کی آخری جنگ اور شکست

یہ آخری جنگ انگلستان و فرانس کی مشہور ''جنگ ہفت سالہ'' کا ضمیمہ تھی جس کا یورپ میں سنہ ۱۷۵۶ء میں آغاز ہوا، اور حکومت فرانس نے اپنے مشہور فوجی سردار کونٹ ڈلالی کو فرانسیسی ہندوستان کی مہم پر مامور کیا کہ وہاں سے انگریزوں کو نکال دے لیکن لالی کسی قدر سخت گیر و تند مزاج آدمی تھا دوپلے کئی سال پہلے ''گورنری'' سے معزول کر دیا گیا تھا اور ہندوستان میں لالی کو اپنے دوسرے عیش دوست اور نافرمان ہموطنوں سے کوئی مدد نہ مل سکی بلکہ بعض اوقات انھوں نے اُسے زک دینے کی کوشش میں اپنے ملک و قوم کو نقصان پہنچانے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ ایک وقت یہ پیش آئی کہ ریاست حیدرآباد سے تعلقات رکھنے کی وجہ سے فرانسیسیوں کی ذمہ داریاں بہت وسیع ہو گئی تھیں اور ادھر حکومت فرانس ایک دفعہ لالی کو بھیج کر ہندوستان کی طرف سے ایسی بے خبر ہو گئی تھی کہ انگریزی بیڑا مدد تازہ دم فوجیں ہندوستان آ گئیں، اور اس کا محاصرہ کرتے کرتے فرانسیسیوں کو خود محصور ہونا پڑا لیکن فرانس والے اپنے قلیل التعداد ہموطنوں کو کوئی مدد نہ پہنچا سکے، پھر پانڈی چیری پر جب محاصرین کی بری اور بحری ناکہ بندی نے سامان خوردنی کا قحط ڈال دیا تو مجبور ہو کر فرانسیسیوں نے شہر کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور اطاعت قبول کر لی (جنوری سنہ ۱۷۶۱ء مطابق سنہ ۱۱۷۴ھ)

(یورپ میں جنگ ہفت سالہ کے بعد جب صلح ہوئی تو فرانس کے قدیم ہندوستانی مقبوضات بھی اُسے واپس ملے (سنہ ۱۷۶۳ء) انگریزوں نے پانڈی چیری کی عمارات کو بے دردی سے گرا کر

---

[١] غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ نوابی تصور کرتا تھا جس کی بنا پر مسٹر اسمتھ صاحب نہایت بازاری پیرائے میں اس کی مذمت کرتے ہیں۔ (دیکھو آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۴۷۶ وغیرہ)

دشمن میں لگے ہوئے تھے۔

معاملات دکن

ہندوستان کے انگریز حکّام کو سب سے زیادہ کد سلطان میسور کے ساتھ تھی اور وہ بھی اپنی جگہ برابر اُن کے خلاف سازباز کرتا رہتا تھا۔ اُسے اپنے ہم وطن ہمسائوں سے بھی نہایت بدگمانی اور خصومت تھی اور اس بات سے ناامید ہو چکا تھا کہ یہ ہمسائے انگریزوں کی نوخیز قوّت کا مقابلہ کرنے میں اس کی مدد کریں گے۔ دراصل پونا کے مرہٹہ سردار تو باہمی نفاق و خودغرضی کے مرض میں ایسے گرفتار تھے کہ کھردا کی فتح سے جو بیش قیمت علاقے انھوں نے حاصل کئے تھے، تین چار سال کے اندر ان کا بیشتر حصّہ ہاتھ سے نکل گیا اور حکومت پونا کوئی تدارک نہ کر سکی لیکن حیدرآباد کے اہل الرّائے کو "نو دولت" حیدرعلی اور اس کے جانشین کے ساتھ ابتدا سے اختلاف تھا۔ اور گذشتہ جنگ میسور نے بھی اس اختلاف کو بڑھا دیا۔ لہٰذا ٹیپو سلطان جیسے خوددار اور خودسر فرمانروا کو حیدرآباد کی طرف سے کسی بھلائی کی آرزو تھی نہ امید۔ اسی کے ساتھ وہ خوب جانتا تھا کہ ایسے قوی دشمنوں میں ریاست میسور کی سلامتی دشوار ہے۔ خود اس کا ملک اس قدر چھوٹا تھا کہ وہ تنہا اپنی قوّت سے متحدہ ہمسایوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ گذشتہ جنگ کے نقصانات کی تلافی ہی میں اس کے کئی سال صرف ہو گئے تھے۔ ایک صورت اپنے بچانے کی یہ تھی کہ انگریزوں سے، جن شرائط پر ممکن ہو، مصالحت کر لی جائے۔ مگر انگریزوں کے سامنے جھکنا سلطان میسور کو کسی حال میں گوارا نہ تھا۔ دوسرے کرناٹک اور بنگالے کی نظیریں اس کے سامنے تھیں جہاں انگریزوں کے دوستانہ رسوخ نے رفتہ رفتہ تسلّطِ حاکمانہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔

الغرض، ٹیپو سلطان کی حفاظتِ خوداختیاری کی کوشش اب ایک مایوسانہ جدوجہد بن گئی تھی کہ کبھی تو وہ مرہٹوں کو انگریزوں سے توڑنے کی سعی کرتا کبھی ریاست حیدرآباد کی بیرونی اور اندرونی لڑائیوں میں سازباز کرتا اور کبھی اپنے ایلچی کابل بھیجتا کہ احمد شاہ ابدالی کے پوتے زماں شاہ کو ہندوستان فتح کرنے کی ترغیب دے لیکن معلوم ہوتا ہے اگر اُسے واقعی کسی بیرونی قوم سے مدد کی امید پیدا ہوئی تو وہ فرانسیسی تھے جن کی انگریزوں کے ساتھ مدّت سے قومی جنگ ٹھنی ہوئی تھی۔

فرانسیسیوں کا حصہ معاملات ہند میں

ہندوستان میں اہلِ فرانس کی جنگی قوت کے ٹوٹنے کا حال گذشتہ اوراق میں

ہماری نظر سے گزر چکا ہے اور پان ڈی چیری کی آخری تسخیر (۱۷۶۱ء مطابق ۱۱۷۴ھ) کے بعد سے وہ ہندوستان میں کوئی ایسا مقام حاصل نہ کر سکے تھے جو ان کی جنگی اور سیاسی قوت کا مرکز بن جاتا۔ تاہم اس قوم کے اکثر افراد ہندوستان کے مختلف حصوں میں موجود تھے؛ اور بعض نے دیسی ریاستوں کی ملازمت میں کافی رسوخ حاصل کر لیا تھا آتشی اسلحہ کی ساخت اور استعمال میں ان کی ہنرمندی صدیوں سے ہندوستان میں مشہور تھی۔ لیکن بارھویں صدی ہجری میں قومی انحطاط نے اہل ہند کو سپاہیانہ فنون میں بھی پسماندہ کر دیا تھا اور اس عہد میں ریموں، دبوئنی، پیراں، لا ہمر وغیرہ فرنگی سپہ سالاروں کے نام آوری پانے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ خود اہل ہند میں جنگی انتظام اور سپہ سالاری کی قابلیت فوت ہوتی جاتی تھی۔

ریاست میسور میں ایسے کسی فرنگی سپاہی کو شہرت حاصل نہ ہوئی تو اس کا سبب یہ تھا کہ خود حیدر علی اور اس کے بیٹے اعلیٰ درجے کے سپہ سالار اور جنگی انتظامات میں فرنگی سرداروں کی مدد سے مستغنی تھے۔ ورنہ انگریزوں کی رقابت نے حکومت میسور کو ابتدا سے اہل فرانس کا دوست بنا دیا تھا اور بالخصوص ٹیپو سلطان کے عہد حکومت میں میسور کا پائے تخت بہت سے آوارہ گرد فرانسیسیوں کا مستقر بن گیا تھا۔ جہاں انھوں نے انقلاب فرانس کی یادگار میں جمہوریت پسندوں کی ایک باقاعدہ انجمن بنائی (۱۷۹۷ء) اور خود سلطان میسور کا نام فرانس کے آزاد "شہریوں" میں درج کر لیا تھا۔

اندرونی استحکام اور جنگی تیاریوں کے ساتھ ٹیپو سلطان کی یہ سب کوششیں دراصل دفاعی نوعیت رکھتی تھیں بلکہ یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ اگر وہ انگریزوں کی بیخکنی کے درپے تھا تو اس کی بڑی وجہ بھی اب یہ رہ گئی تھی کہ ان کی قوت پذیری میں خود اسے اپنی ریاست کے لالے پڑے تھے۔ ورنہ اسے فرانسیسیوں سے اگر کسی بڑی امداد یا ہند پر حملے کی امید تھی بھی تو تھوڑے ہی دن بعد نپولین کی مصر و شام میں ناکامی (۱۷۹۹ء) نے اسے باطل کر دیا۔ البتہ سلطان میسور کی اہل فرانس کے ساتھ دوستی، انگریزوں کے خلاف جنگی اتحاد کے منصوبے اور نپولین یا جزیرہ موریشس کے فرانسیسی گورنر سے خط کتابت انگریزوں کو اشتعال دلانے کے کافی اسباب تھے۔ نئے گورنر جنرل کے دل میں شوق کشور کشائی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مدراس کے انگریز حکام نے ہر چند

میسور کی آزادی کا خاتمہ

لیت ولعل کی[1] ولزلی نے ایک نہ سنی اور سلطانِ میسور کیساتھ جنگ کرنیکا فیصلہ کرلیا۔ اسے تقدیر کی یاوری سمجھنا چاہئیے کہ ولزلی کے عزم مصمم کو ایک غیر متوقع واقعے سے بڑی تقویت پہنچ گئی۔ وہ یہ کہ اسی زمانے میں حیدرآباد کے فرانسیسی سپہ سالار موسیو ریمون نے وفات پائی۔ اور وہ جرار سپاہ جسے فرانسیسیوں کی سعی و قابلیت نے ہندوستان کی بہترین فوج بنادیا تھا سیاسی تدبیروں سے بلا خرخشہ انگریزوں کے قابو میں آگئی اور اسے ہتیار لے کے برطرف کردیا گیا۔ اس واقعے کا ہم اس کتاب کے پہلے باب میں ذکر کرچکے ہیں۔ یہاں دہرانے سے یہ جتانا مقصود ہے کہ اس طرح بغیر لڑے بھڑے ریاست حیدرآباد کے بے بس رہ جانے سے جہاں یہ ریاست انگریزوں کے زیر اثر آگئی وہیں فتح میسور میں بھی آسانیاں پیدا ہوگئیں کیونکہ گو حکومت حیدرآباد کی ٹیپو سلطان سے مخالفت تھی لیکن اس بات کا امکان تھا کہ وہ انگریزوں کا میسور پر قابض ہوجانا پسند نہ کرے گی اور اگر ٹیپو سلطان کو مدد نہ دے تو بھی کم سے کم اپنے فرانسیسی سرداروں کے اثر سے جنگِ میسور میں کوئی حصہ نہ لے گی۔ مگر یہ سب قیاس غلط ثابت ہوئے۔ مذکورۂ بالا واقعے نے صورتِ حالات کو بالکل بدل دیا اور اب حیدرآباد کی فوج انگریزوں کے حلیف کی حیثیت سے میسوری علاقوں پر حملہ آور ہوئی۔

میسور کی اس چوتھی اور آخری جنگ نے زیادہ طول نہ کھینچا۔ بلکہ تین چار مہینے کے اندر ختم ہوگئی (۱۷۹۹ء مطابق ۱۲۱۳ھ) شروع سے اتحادیوں نے بڑے ساز و سامان اور اہتمام کے ساتھ تین طرف سے نرغہ کیا تھا۔ اور ان کی زبردست فوجوں نے کامیابی سے بڑھکر سری رنگ پٹن کا محاصرہ کرلیا۔ آغاز جنگ سے محاصرے کے وقت تک سلطانِ میسور نے کئی بار صلح کی سلسلہ جنبانی کی لیکن ولزلی اس کی آزادی کا خاتمہ کرنے کا پختہ ارادہ کرچکا تھا اور "شیر میسور" کو انگریزوں کی محکومانہ اطاعت کسی حال میں گوارا نہ تھی وہ بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا اور اس کی موت اور سری رنگ پٹن کی تسخیر کے ساتھ تمام ریاست فتحمندوں کے ہاتھ میں آگئی۔ میسور کا تقریباً نصف علاقہ وہاں کے

[1] مدراس کے گورنر نے اول تو جنگ کے جھگڑوں میں پڑنے کو احتیاط کے خلاف بتایا دوسرے غالباً کئی بار ولزلی کو یاد دلایا تھا کہ میسور پر فوج کشی کرنا قانون ہندوستان مجریہ ۱۷۸۴ء اور نیز معاہدہ سری رنگ پٹن کے خلاف ہے ("حیدر علی ۔۔۔ سلطان" صفحات ۱۸۲ وغیرہ)

قدیم راجاؤں کے خاندان کے نام واگذاشت کر دیا گیا تھا لیکن وہ بھی عرصہ دراز تک انگریزی رزیڈنٹ کے اختیار و نگرانی میں رہا۔ باقی نصف میں سے چند اضلاع ریاست حیدر آباد کے حصے میں آئے تھے مگر ولزلی نے سال ڈیڑھ سال بعد ہی فوجی مصارف کے نام سے انھیں واپس لے لیا۔ یہ مصارف اس انگریزی فوج کے تھے جسے نئے معاہدے کی رو سے نواب نظام الملک کو اپنے ملک میں رکھنا ضروری تھا۔

مزید مقبوضات (الحاق)

میسور کا قبضہ، جنگ و فتح کا ثمرہ تھا لیکن ادھر سے فرصت ملتے ہی ولزلی نے ان ریاستوں پر قبضہ کرنا شروع کیا جو اب تک انگریزوں کی دوست یا "زیر حفاظت" تھیں جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ولزلی جس طرح ممکن ہو انگریزی مقبوضات بڑھانے چاہتا تھا[1] مگر لطیفہ یہ ہے کہ اپنی اس حکمت عملی کو وہ قانون ۱۷۸۴ء کے عین مطابق بتاتا تھا جس کے یہ الفاظ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ "ہندوستان میں فتوحات اور اضافہ مقبوضات کے منصوبوں پر عمل کرنا۔۔۔ اہل انگلستان کی خواہش، راستبازی اور اصول عمل کے سراسر منافی" ہے!

بہر حال، سب سے اول انگریزی حکومت نے تنجور و سورت کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قبضہ کیا (۱۷۹۹ء) جو مدت سے کمپنی کی دوست تھیں۔ پہلی ریاست کی وراثت کے متعلق راجہ کے خاندان والوں میں نزاع تھی۔ انگریزوں نے سمجھا بجھا کر مسند نشین راجہ کو آمادہ کر لیا کہ وہ کمپنی سے وظیفہ لے کر ریاست سے دست بردار ہو جائے[2] انھی دنوں سورت کے نواب نے وفات پائی اور اس کی ریاست کے متعلق بھی اسی قسم کا انتظام کر دیا گیا۔ اس الحاق کے دو سال بعد نواب عمدۃ الامرا والی کرناٹک نے وفات پائی۔ (۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء) اس ملک میں نواب محمد علی ہی کے زمانے سے انگریزوں کا بہت کچھ رسوخ جم گیا تھا اور ایک دو مرتبہ انھوں نے تمام اختیارات بھی (انتظام کیلئے) نواب سے لے لئے تھے۔ بایں ہمہ نواب محمد علی اور عمدۃ الامرا جس طرح ممکن ہوا اپنا بھرم بنائے رہے اور ان کی بڑی تدبیر یہ تھی کہ مدراس کے انگریز حکام کو رشوتیں اور نذرانے دے دے کر

[1] ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ وہ ملک گیری کے اصول اور اس یقین واثق سے کہ جو علاقہ براہ راست انگریزوں کے قبضے میں آئیگا اس کی فلاح و بہتری میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں، ولزلی کو آمادہ کر دیا کہ کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ کرنیکا کوئی موقع ہاتھ سے نہ [illegible] ص ۵۱۷

[2] [illegible]

اپنا طرفدار کر لیتے تھے لیکن ولزلی پر یہ جادو کارگر نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے عمدۃ الامرا کے فرزند علی حسین سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ سالانہ وظیفہ لے کر اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔ علی حسین میں انگریزوں سے لڑنے کی قوت نہ تھی لیکن اس کی غیرت نے اس قسم کا عہد و پیمان کرنا گوارا نہ کیا اور شاید اس کو یہ بھی امید تھی کہ انگلستان میں کوشش کی جائے گی تو گورنر جنرل کا فیصلہ مسترد ہو جائے گا۔ ولزلی اس کی پیش بندی کر چکا تھا ادھر نواب محمد علی کا ایک دوسرا پوتا (عظیم الدولہ) سالانہ وظیفے پر خطاب نوابی لے کر ریاست چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا اور ولزلی نے اسی کو عمدۃ الامرا کا جانشین مان کر علاقہ کرناٹک کا الحاق کر لیا۔

یہ جولائی سنہ ۱۸۰۱ء (۱۲۱۵ھ) کا واقعہ ہے۔ اس سے چند مہینے قبل (جنوری ۱۸۰۱ء) نواب وزیر والی اودھ نے "جو اپنی بے بسی کی وجہ سے کرب کی حالت میں تھا" ایک نئے معاہدے پر مجبوراً دستخط اور تقریباً آدھا ملک انگریزوں کے حوالے کر دیا جس میں گورکھپور، بریلی، فتح پور وغیرہ متعدد زرخیز اضلاع شامل تھے۔ ولزلی کی اس کارروائی کو، ونسنٹ اسمتھ نے بھی جو اس کا بہت مداح اور طرفدار ہے قابل اعتراض اور ننگی زبردستی تسلیم کیا ہے۔[۵۲]

مرہٹوں کے معاملات

اب نواب نظام الملک کی طرح، والی اودھ بحیثیت ایک ماتحت حلیف کے، اور کرناٹک و میسور بحیثیت ملک مفتوحہ کے حکومت انگریزی کے ہاتھ میں تھے۔ اور ہندوستان بھر میں صرف مرہٹے انگریزوں کے حریف مقابل رہ گئے تھے۔ پنجاب نے ابھی تک آزاد ریاست کی حیثیت یا کوئی قابل ذکر قوت حاصل نہیں کی تھی سلاطین مغلیہ کے وارث کو عمر و حکومت کے انحطاط نے بیکار کر دیا تھا۔ لہذا ولزلی نے جسے تمام کشور ہند پر انگریزی سیادت قائم کرنے کی دھن بندھی ہوئی تھی، مرہٹوں کی طرف توجہ مبذول کی اور پیشوا باجی راؤ (ثانی) کو انگریزوں کے ساتھ اسی قسم کا معاہدہ ("عہد معاونت" یا سب سڈئیری الائنس) کرنے پر آمادہ کیا جیسا کہ دو سال پہلے نواب نظام الملک نے

---

۵۱ نواب محمد علی اور عمدۃ الامرا کے چند خطوط ولزلی نے مہیا کئے تھے جن سے ان کی والی میسور کے ساتھ سازباز ظاہر ہوتی تھی لیکن وہ ان تو انکی اصلیت ہی مشتبہ تھی (اڈورس ص ۵۸۱) و ثانیاً اگر وہ اصلی تھی تو بھی باپ دادا کے جرم کی علی حسین خاں کو سزا دینے کی کچھ قرین انصاف و درستی نہیں نظر آتی۔ ۵۲ اڈورس ص صفحہ ۵۹۰۔

کیا تھا اور جس کی رُو سے معاہدہ کرنے والی ریاست کو ایک انگریزی فوج اپنے خرچ سے ملک میں رکھنی پڑتی تھی کہ بوقت ضرورت سرکار انگریزی کو مدد دے۔ نیز اقرار کرنا ہوتا تھا کہ وہ (ریاست) حکومتِ انگریزی کے مشورے کے بغیر کسی دوسری ریاست سے نہ جنگ کرے گی نہ اتحاد۔ اور نہ انگریزوں کے سوا کسی دوسری فرنگی قوم کے آدمی کو اپنی سرحد میں نوکر رکھے گی۔

یہ شرطیں قبول کرنا گویا انگریزوں کی سیادت یا سیاسی برتری کو تسلیم کر لینا تھا۔ ولزلی کے خیال میں ان سے کم شرائط پر کسی دیسی رئیس کے ساتھ مصالحت رکھنی ممکن نہ تھی اور پیشوا سے اِن شرطوں کے مان لینے پر وہ اس طرح اصرار کرتا تھا کہ گویا اُسے اس امر کا مطلق احساس ہی نہیں کہ وہ درحقیقت پیشوا اور تمام مرہٹہ سرداروں کو اس بات کی صلاح دے رہا ہے کہ اپنی خود مختاری چھوڑ کر انگریزوں کے محکوم محض بن جائیں۔[۵]

یہ بات کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے کہ ولزلی پیشوا کی کمزوری اور دوسرے مرہٹہ رئیسوں کی قوت و خود مختاری سے بے خبر ہو لیکن سب سے اوّل پیشوا سے کے ساتھ معاملہ کرنے میں مصلحت یہ تھی کہ اگر مرہٹہ قوم کا یہ برائے نام سردار قابو میں آ گیا تو پھر دوسرے رئیسوں کے معاملات میں دخل دینے کا قانونی جواز پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ گو وہ پیشوا سے اپنی جگہ مدت سے خود مختار ہو گئے تھے لیکن رسمی طور پر پونا کی صدر حکومت کے تابع تھے۔ دوسرے یہ کہ مرہٹوں کی چاروں آزاد قوتوں میں پیشوا ہی کی قوت سب سے کمزور نظر آتی تھی اور نانا فرنویس کی وفات (سنہ ۱۸۰۰ء) کے بعد پونا میں حصولِ اقتدار کے لئے جو خانہ جنگی برپا ہوئی اُس نے پیشوا کو اور بھی پریشان اور بیرونی امداد کا محتاج بنا دیا تھا۔

باایں ہمہ باجی راؤ اوّل اوّل ولزلی کی مذکورہ بالا شرطیں ماننے پر تیار نہ تھا اور اسے امید تھی کہ پونا کے اندرونی جھگڑوں میں خود اس کا فریق کامیاب ہوگا لیکن انگریزوں کے نصیب کی یاوری کہنا چاہیئے کہ مرہٹوں کی اس خانہ جنگی کے سب سے خونریز معرکے میں پیشوا کے دوست دولت راؤ (سندھیا) کو شکست ہوئی اور میدان جسونت راؤ ہلکر کے ہاتھ رہا۔ (جنگ پونا۔ اکتوبر سنہ ۱۸۰۲ء مطابق سنہ ۱۲۱۷ھ) سندھیا کے شکست کھاتے ہی باجی راؤ پونا سے بھاگ گیا تھا۔

---

[۵] اوبس ہس ۵۹۶

دوسری جنگ مرہٹہ

پھر جسونت راؤ ہلکر نے ہر چند اس کو بلایا اور صلح و آشتی کی تدبیریں کیں، وہ نہ آیا اور یہ واقعہ اس زمانے کے طبقۂ اعلیٰ کی دماغی اور اخلاقی کیفیت ظاہر کرتا ہے کہ باجی راؤ نے اپنے ہم وطنوں کی دوستی یا زیادہ سے زیادہ محکومی قبول کرنے پر، انگریزوں کی محکومی قبول کرنے کو ترجیح دی اور انگریزی امداد کے معاوضے میں ولزلی کی تمام شرطیں تسلیم کرلیں[1] (عہد نامہ بسین دسمبر ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۷ھ)

اب ایک انگریزی فوج نے باجی راؤ کو ساتھ لے کر پونا پر پیشقدمی کی۔ ہلکر اپنی مذکورۂ بالا کامیابی کے بعد باجی راؤ کے بھائی (امرت راؤ) کو پیشوا بنا گیا تھا لیکن اس نے یعنی (امرت راؤ) نے باجی راؤ کے دوبارہ پونا آنے کی مزاحمت نہ کی اور سالانہ وظیفہ لے کر بنارس چلا گیا۔ باجی راؤ انگریزوں کی مدد سے دوبارہ حکومت پونا پر بحال ہوا اور اس واقعے کی اطلاع کے ساتھ ہی برار کے بھونسلا راجہ اور مالوے کے ہلکر و سندھیا رئیسوں کو ولزلی نے جتا دیا کہ اب اسی قسم کا معاہدہ کئے بغیر، جسے باجی راؤ نے قبول کرلیا ہے، کوئی مرہٹہ رئیس پونا کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتا۔ پھر بھونسلا سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنی فوجیں کمپنی کے حلیف نواب نظام الملک کی سرحدوں کے قریب سے دور ہٹا لے۔ جب اس کی تعمیل میں تاخیر ہوئی تو ولزلی نے، جو پہلے ہی وسیع پیمانے پر جنگ کے ساز و سامان کر رہا تھا۔ اعلان جنگ کردیا (اگست ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ)

اس جنگ کے مشہور معرکے ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہوئے اور اول اول بھونسلا اور سندھیا کے مقابلے میں انگریزوں کو قریب قریب ہر جگہ کامیابی ہوئی لیکن ہلکر نے جو اندرونی نفاق کی وجہ سے اپنے ہم قوموں کے ساتھ شریک نہ ہوا تھا جاٹوں اور پنڈاروں کی مدد سے اپنا علیحدہ جتھا بنایا اور اگرچہ اس کے تحت میں نہ اس قدر بڑی اور منتظم فوج تھی نہ ایسا عمدہ ساز و سامان تھا جیسا کہ انگریزوں یا سندھیا

[1] یعنی انگریزوں کی امداد سے اپنی حکومت پر بحال ہونے کے عوض میں۔ انگریزی فوج کی کم سے کم چھ پلٹنیں اپنے ملک میں رکھنی اور ان کے مصارف (۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ) ادا کرنے قبول کیئے۔ سورت اور بڑودہ پر حکومت پونا کو جو دعاوی تھے ان سب سے باجی راؤ دست بردار ہوگیا اور "عہد معاونت" کی دیگر شرائط بھی تسلیم کریں۔

کے پاس تھا، بایں ہمہ انگریزوں کو سب سے زیادہ دشواری تیز ناکامی اسی کے مقابلے میں پیش آئی اور حق یہ ہے کہ انہی آخری معرکوں نے ولزلی کی فتوحات اور امور کو بہت کچھ دھندلا کر دیا اور انگلستان میں نظمائے کمپنی بس سے ناراض ہو گئے

کمپنی کا غلبہ سندھیا اور بھونسلا پر۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ دولت راؤ سندھیا کا مالوے اور نواح دلی کے علاقوں پر قبضہ تھا۔ شاہ عالم کو اسی زمانے میں اس نے نجیب آباد کے پٹھانوں سے نجات دلائی مگر خود اپنا محکوم بنا لیا۔ پونا میں اسے ہلکر کے مقابل شکست ہوئی لیکن ابھی وہ دوبارہ وہاں اپنا اقتدار جمانے سے مایوس نہ ہوا تھا اور آغاز جنگ کے وقت بھی دکن ہی کے علاقوں میں بھونسلا کا شریک و مددگار تھا۔ ان وسیع ذمہ داریوں نے اول تو اس کی فوجی قوت کو منقسم کر دیا دوسرے جنگ چھڑتے ہی انگریزوں نے اعلان کیا کہ مرہٹوں کی فوج کے جو فرنگی یا ہندوستانی سردار و سپاہی نوکری چھوڑیں گے انہیں اسی تنخواہ پر کمپنی کی سرکار میں ملازمت دے دی جائیگی۔ چنانچہ بہت سے انگریز اور دوسرے فرنگی جو سب سے زیادہ تعداد میں سندھیا کے ملازم تھے عین لڑائی کے وقت علیحدہ ہو گئے اور اس واقعے نے بھی اس کی جدید قواعد دان فوج کو ایک حد تک کمزور کر دیا[۱]۔

جنگ کا پہلا معرکہ اورنگ آباد کے قریب آسئی میں ہوا (ستمبر ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ) اور قلت تعداد کے باوجود ولزلی کے بھائی آرتھر ولزلی نے بھونسلا اور سندھیا کو شکست دی۔ سندھیا نے اپنی فوجیں شمال میں ہٹا لیں اور بھونسلا کو ایک اور شکست کھا کے اطاعت یا اسی قسم کی شرطیں قبول کرنی پڑیں (عہدنامہ دیوگاؤں نومبر ۱۸۰۳ء) جیسی کہ پیشوا مان چکا تھا۔

مرہٹہ جتھے میں سب سے زیادہ قوی سردار سندھیا تھا۔ اس کی فوجیں فرنگی سرداروں کے ماتحت آتشی اسلحہ سے مسلح اور مغربی قواعد و اصول کے مطابق مرتب و آراستہ کی گئی تھیں اور مشہور تھا کہ جیسا زبردست توپخانہ سندھیا کا ہے ایسا ہندوستان میں کسی کے پاس نہیں۔ آسئی کی جنگ میں جب سندھیا کو پسپا ہونا پڑا

---

[۱] ڈف کی تاریخ مرہٹہ جلد سوم ۲۴۴

تو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اس لڑائی میں وہ اپنی پوری فوج اور قوت سے کام نہیں لے سکا تھا لیکن اسی سال جنرل لیک نے اس کی شمالی فوجوں کو جا بجا شکستیں دیں اور آخر میں پہلے دہلی کے قریب سندھیا کے بہت بڑے لشکر پر نمایاں غلبہ حاصل کیا (ستمبر ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ) اور پھر آگرہ لے کر الور کے قریب ایک خونریز معرکے میں کامل فتح پائی (جنگ لاسواری اکتوبر ۱۸۰۳ء)

اس طرح چند ہی مہینے کے اندر سندھیا کا زور ٹوٹ گیا اور اسے بھی انگریزوں سے دب کر صلح کرنی پڑی (عہد نامۂ سورجی ارجن گاؤں۔ دسمبر ۱۸۰۳ء) جس کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ سندھیا آئندہ "ہندوستان خاص" کے علاقے اور بادشاہ دہلی کے معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انگریزوں کی بہت بڑی کامیابی تھی اور اسی بنا پر اگر ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) کو ممالک ہند پر انگریزی حکومت کا پہلا سال قرار دیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا لیکن اول تو اتنے وسیع ملک پر خاطر خواہ تسلط قائم ہونے میں قدرتاً تاخیر و دشواری پیش آئی دوسرے مرہٹوں کے تیسرے سردار ہلکر کی لڑائیوں نے بھی خلاف امید اس قدر طوالت اور ایسی صورت اختیار کر لی کہ لارڈ ولزلی کو اپنی فتوحات پر پوری طرح خوش ہونے کا موقع نہ مل سکا اور کم سے کم چند سال کے لیئے "انگریزی سیادت" کی تکمیل مشتبہ نظر آنے لگی۔

ہلکر سے لڑائیاں

اندور کے اس مرہٹہ رئیس (ہلکر) کی پونا میں عارضی کامیابی کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اول اول اس نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تو اس کی ایک وجہ یہی تھی کہ وہ سندھیا اور بھونسلے کا رقیب تھا۔ دوسرے ہلکر ان قدامت پسند مرہٹوں میں تھا جو تیرھویں صدی ہجری (انیسویں عیسوی) کے شروع ہو جانے پر بھی فن جنگ کے جدید اصول و قواعد کی ہنسی اڑاتے تھے اور کم سے کم اپنی قوم مرہٹہ کے لیئے اسی "قزاقانہ جنگ" کے طریقوں کو مناسب و موزوں سمجھتے تھے جو ملک عنبر حبشی کے زمانے سے لے کر دوسرے پیشوا باجی راؤ کے عہد تک اہل دکن میں بہت مقبول رہے تھے۔ جب سندھیا کو انگریزوں کے مقابلے میں ہر جگہ شکست ہوئی تو گویا ہلکر کے مذکورۂ بالا خیالات کی تصدیق ہو گئی اور اس کی نہ صرف عزت و قدر اپنے ہم وطنوں میں بڑھی بلکہ اب ہندوستان بھر میں اسی کی ایک ریاست اور قوت ایسی

رہ گئی جو ممالکِ ہند کے نو وارد دعوی داروں سے مغلوب نہ ہوئی تھی۔

ان اسباب نے سیاسی اقتدار کے ساتھ ہلکر کا غرور بڑھا دیا اور حکومتِ انگریزی کی طرف سے مصالحت اور عہد معاونت کی تحریک ہوئی تو اس نے جواب میں اس قسم کے مطالبات کیئے جنھیں ولزلی جیسے شاہانہ مزاج کا آدمی اسقدر فتوحات حاصل کرنے کے بعد کبھی قبول نہ کرسکتا تھا۔ غرض نئے عیسوی سال (۱۸۰۴ء) میں دوبارہ جنگ شروع ہوگئی اور شمالی ہند، گجرات، اور دکن تین طرف سے انگریزی افواج نے ہلکر کے علاقوں پر پیشقدمی کی۔ سندھیا نے بھی انگریزوں کی اعانت کا اقرار کیا تھا اور اوّل اوّل اس کے چند دستے انگریزوں کے ساتھ تھے لیکن گرانٹ ڈف کا بیان ہے کہ جب ابتدا میں انگریزوں کو ناکامی ہوئی تو یہ مرہٹہ سپاہی انگریزوں کا ساتھ چھوڑ کر ہلکر سے جا ملے۔[۱]

جنوب آگرہ کے جاٹ اور پنڈاروں کا سرگروہ امیر علی اس لڑائی میں ہلکر کے رفیق ہو گئے تھے اور خود ہلکر کا قول یہی تھا کہ ہمارا ملک ــــ وہاں گھوڑے کی زین پر ہے! بالفاظ دیگر یہ وسیع پیمانے پر ایک قزاقانہ جنگ تھی کہ وہ غنیم جو والیانِ بنگال و اودھ، سلطانِ میسور و سندھیا کی منتظم افواج سے مغلوب نہ ہوسکا شاید ہلکر کے ان بے قاعدہ جرگوں کے ناگہانی حملوں سے تنگ آکر ہٹ جائے؟ اتفاق سے گجرات و دکن کی انگریزی فوجیں بھی وقت پر مالوے نہ پہنچ سکیں اور الور و جے پور کی طرف سے جو فوج کرنل مونسن کے ماتحت بڑھی تھی اُسے چنبل کے جنوب میں ہلکر نے سخت شکست دی (جنگ مکندرا جولائی ۱۸۰۴ء مطابق ۱۲۱۹ھ) مونسن پسپا ہوا اور اس پسپائی میں سخت مصیبتیں اٹھاتا ہوا بیانہ تک آیا۔ اس اثنا میں گریزپا مرہٹے اور پنڈارے برابر انگریزی فوج کے گرد منڈلاتے اور حملے کرتے رہے۔ مونسن کے تھکے ہارے سپاہی آخر ان پیہم حملوں کی تاب نہ لاسکے اور بیانہ کی لڑائی میں انکی صفیں اور ترتیب ٹوٹ گئی اور جس کا جدھر منہ اٹھا فرار ہوگیا[۲] (اگست ۱۸۰۴ء)

اس کامیابی نے ہلکر کے حوصلے بڑھا دیئے۔ ہندوستان میں ہر طرف

۱؎ تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۲۷۵ و ۲۸۱ و ۲۸۴

۲؎ تاریخ مرہٹہ۔ جلد سوم صفحہ ۲۸۵

اس کی ہمت و بہادری کے چرچے ہونے لگے اور اگرچہ دکن اور مالوے میں اس کے قدیم مقبوضات پر انگریزوں کا قبضہ ہوتا جاتا تھا لیکن ان باتوں کی اسے چنداں پروا نہ تھی۔ اس کا "ملک وہاں گھوڑے کے زین پر" تھا۔ دوسرے اب وہ آگرے سے بڑھ کر دہلی پر پیشقدمی کر رہا تھا کہ جس طرح ممکن ہو شاہ عالم بادشاہ تک پہنچ جائے اور ظاہر میں لوگوں کی نظر میں وہی رسوخ و مرتبہ حاصل کرے جو پایۂ تخت دہلی پر قابض ہونے کی بدولت پہلے سندھیا کو اور اب انگریزوں کو حاصل ہو گیا تھا۔

مگر واضح رہے کہ ہلکر کی ساری کامیابی ایک ایسے پریشان حال لشکر کے مقابلے میں ہوئی تھی جو پہلی ناکامی کے بعد خود ہی جنگ سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کرتا رہا۔ ورنہ ہلکر کے بے قاعدہ گروہ کسی مستقل مزاج حریف سے جم کر لڑنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے چنانچہ جب دہلی کی مٹھی بھر انگریزی فوج نے استقلال کے ساتھ مدافعت کی تو چند ہی روز میں ہلکر کے بے چین سپاہیوں کا دل گھبرا گیا اور وہ ہٹ کر دوآب کے علاقوں میں پھیل گئے۔

جنگ ڈیگ و بھرتپور

لیکن اب خود جنرل لیک ہلکر کے مقابلے میں پہنچ گیا تھا اور یہ وہ لائق و مستعد سپہ سالار ہے کہ اگر انگریزوں کی سلطنت ہند کو فقط ان کی جنگی فتوحات کا نتیجہ سمجھا جائے تو شاید لیک سے زیادہ کوئی شخص انگریزوں میں بانی سلطنت کہلانے کا مستحق نہ ہوگا۔ مگر اس جگہ یہ صراحت کر دینی چاہئیے کہ لیک یا دوسرے انگریز سپہ سالاروں کے ماتحت جو سپاہ تھی اس میں قریب قریب تمام ہندوستانی سپاہی تھے اور انھی کو انگریزوں کے ماتحت جدید قواعد جنگ سکھا کر مغربی طور پر مرتب و آراستہ کر لیا جاتا تھا۔ پس انگریزوں کی جنگی فتوحات میں سپاہیوں کا جس قدر حصہ تسلیم کیا جائے گا اس کے حقدار ہندوستان ہی کے باشندے ہوں گے اور افواج انگریزی سے بھی یہاں عام طور پر اہل ہند ہی کی وہ فوجیں مراد ہیں جو سرکار کمپنی کی ملازم اور انگریز سرداروں کے ماتحت تھیں۔

القصہ لیک نے نہایت خوبی سے ہلکر کی فوجوں کو ہر طرف سے گھیر گھیر کر دوبارہ میوات یعنی آگرہ اور دہلی کے مغرب میں سمٹنے پر مجبور کیا جہاں اس کے حاشیہ حلیفوں کے بعض مستحکم قلعے بنے ہوئے تھے۔ انھی میں سے دو قلعوں کی پناہ لے کر ہلکر نے دو بڑی لڑائیاں لڑیں مگر دونوں جگہ ناکامی ہوئی۔ پہلے ڈیگ کا قلعہ انگریزوں نے

تسخیر کرلیا اور اس کے بعد قلعۂ بھرتپور کو گھیر کر کئی مرتبہ یورش کی۔ سپاہیوں کی دلیری اور جاں بازی کے باوجود یہ قلعہ فتح نہ ہوسکا لیکن ہلکر کی فوجیں مایوس و ناکام ہوکر پہلے سے ٹوٹ گئی تھیں۔ لہٰذا اس کے حلیف راجہ بھرتپور نے انگریزوں سے صلح کرلی اور بیس لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ اور ہلکر سے قطع تعلق کرنے کی شرطیں مان لیں۔ (۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۱۹ھ)

صلح

ہلکر اپنے حلیفوں کو صلح پر آمادہ دیکھ کر وسطی راجپوتانہ میں ہٹ گیا تھا اتفاقاً اسی زمانے میں سندھیا سے ولزلی کی ایسی ان بن ہوگئی کہ دوبارہ جنگ کے آثار نظر آنے لگے۔ لہٰذا جب تک ہلکر کو امید رہی کہ شاید سندھیا اس کے ساتھ مل کر پھر ایک مرتبہ انگریزوں سے تیغ آزمائی کرے، اس وقت تک وہ اجمیر میں ٹھیرا رہا لیکن اس اثنا میں نظمائے کمپنی نے مختلف اسباب سے جن کا ذکر آگے آتا ہے لارڈ ولزلی کو واپس بلاکر کارنوالس کو دوسری مرتبہ ہندوستان بھیجا (جولائی ۱۸۰۵ء) تو اس نے آتے ہی سندھیا سے مصالحانہ گفتگو شروع کردی۔ ادھر لیک نے بھرتپور سے فرصت حاصل کرتے ہی پھر تھوڑی سی فوج ہلکر کے تعاقب میں روانہ کی اور اس نے سندھیا کی طرف سے مایوس ہوکر پنجاب کی راہ لی جہاں اُسے سکھوں اور افغانوں سے امداد کی توقع تھی۔ مگر لیک بھی برابر دریائے بیاس تک ہلکر کے تعاقب میں چلا آیا تھا اور غالباً اسی کے سر پر آپہنچنے کے رعب سے پنجاب میں شکست خوردہ ہلکر کی فوجی امداد کرنے پر کوئی آمادہ نہ ہوا۔ دوسرے کارنوالس اور اس کے جانشین بارلو کی طرف سے صلح کی ایسی نرم شرائط پیش کی گئیں کہ ہلکر نے خوشی سے صلح کرلی اور اپنی ریاست میں چلا آیا (دسمبر ۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ)

۲۔ جنگ و فتوحاتِ جنگ میں وقفہ

ولزلی کی علیحدگی

آج کل ولزلی کو اس کے ہم وطن سلطنتِ ہند کے سب سے نامور بانیوں میں شمار کرتے اور بجا طور پر اپنی قوم کا محسن سمجھتے ہیں لیکن اس کی حکومت کے زمانے میں اس کے اولوالعزمانہ منصوبوں کو انگلستان کے اہل الرائے ابتدا سے مخدوش جانتے تھے۔ صرف ولزلی اور اس کے لائق سپہ سالاروں کی پیہم فتوحات نے اُن کی زبان بند کردی تھی مگر جب ان فتوحات کا سلسلہ رکا اور ہلکر کے مقابلے میں مونسن کو شکست ہوئی تو توتمام وزرائے انگلستان نے ولزلی کو واپس بلانے کا فیصلہ کرلیا اور دوبارہ کارنوالس

کو منتخب کیا جس کی صلح پسندی اور دور اندیشی پر پٹ (وزیر اعظم) کو کامل اعتماد تھا وزرا کے اس فیصلے کو سب سے زیادہ تقویت خود کمپنی کے حصہ داروں سے پہنچی جو ولزلی کے جنگی مصارف برداشت کرتے کرتے عاجز آ گئے تھے۔ بے شبہ نئی فتوحات سے کمپنی کے مقبوضات میں نمایاں اضافہ ہوا لیکن اوّل تو ابھی انکی آمدنی پوری طرح وصول نہ ہوتی تھی۔ دوسرے جنگ کے خرچ نے کمپنی کے خزانے کو خالی کر دیا تھا اور کمپنی کے حصہ دار فقط سالانہ منافع کو دیکھتے تھے اور ان میں سے بعض کی آمدنی کا ذریعہ بھی واقعی یہی منافع تھا لہٰذا آئندہ فوائد کثیرہ کی امید پر وہ وقتی خسارے کی تاب نہ لا سکے اور ان کے ایسے بڑے گروہ نے ولزلی کو واپس بلانے پر اصرار کیا۔ خلاصہ یہ کہ اس سے پہلے کہ ولزلی اپنے منصوبے کو کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا سکے۔ وہ انگلستان بلا لیا گیا اور انگریزوں کی کامل سیادت حاصل ہونے کے کام میں چند سال کا وقفہ پڑ گیا۔

مصالحانہ طرز عمل

لارڈ کارنوالس دوبارہ گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا تو بہت ضعیف و علیل تھا اور چند ہفتے کے بعد ہی فوت ہو گیا (اکتوبر ۱۸۰۵ء) لیکن ونسنٹ اسمتھ کے قول کے مطابق جب تک ہاتھ میں قلم لینے کا دم باقی رہا۔ وہ برابر اپنے پیشرو (ولزلی) کے طریق عمل کو الٹنے میں مصروف رہا۔ ۔ ۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ گوالیار اور گوہد سندھیا کے حوالے کر دیئے جائیں۔ انگریزی علاقے کی سرحد دریائے جمنا قرار دی جائے اور جے پور اور دوسری راجپوت ریاستوں سے قطع تعلق کر کے مرہٹہ لٹیروں کو ان میں لوٹ مار کی بالکل آزادی دے دی جائے۔ ۔ ۔ (صفحہ ۶۰۸)

لیک نے جو اپنی جنگی خدمات کے سلسلے میں "لارڈ" کے خطاب سے مشرف ہوا تھا، اس الٹے طرز عمل کی بہت مخالفت کی لیکن کارنوالس نے کوئی حجت و دلیل نہ سنی اور یہ سمجھ کر اپنی رائے پر قائم رہا کہ جب مرہٹے راجپوتانے کے لڑائی جھگڑوں میں الجھے رہیں گے تو انگریزی علاقوں کو امن مل جائے گا اور کارنوالس کے بعد سر جان بارلو نے بھی اس طریق عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ سر جان کلکتہ کو کونسل کا سب سے پرانا رکن تھا کارنوالس کی وفات پر حسب قاعدہ گورنر جنرلی کا کام اس نے اپنے ہاتھ میں لیا اور نظمائے کمپنی نے بھی اسی کو اس عہدے پر

مستقل کردیا۔ وہ نظمائے کمپنی اور وزرائے انگلستان کا نہایت مطیع و فرماں بردار تھا اور اسی لئے کارنوالس کے مصالحانہ طرزِ عمل پر مضبوطی سے کاربند رہا۔ اُس کی یہی "کمزوری" تھی جس کی بناء پر بعض انگریز مورّخ بارلو کو ہندوستان کا "سب سے گھٹیا" (دی ہینسٹ) گورنر جنرل کہتے ہیں[۵۱]۔ اور شاید اس بات کی بھی رعایت ملحوظ نہیں رکھتے کہ ولزلی کی مسلسل جنگ و جدال کے بعد امن و امان خود کمپنی کیواسطے مفید اور ضروری تھا کہ چند سال دم لے کر کافی روپیہ اور فوج فراہم کرے چنانچہ بارلو نے سندھیا اور ہلکر کے ساتھ نرم سے نرم شرطوں پر صلح[۵۲] کرکے، دو ہی سال میں کمپنی کا خالی خزانہ دوبارہ بھر دیا اور حصّہ داروں کو سالانہ منافع کی طرف سے بالکل مطمئن کردیا[۵۳]۔

مزید برآں بارلو کی عدم مداخلت یا کمزوری جو کچھ سمجھئے صرف ہلکر کے ساتھ معاملہ کرنے میں تھی ورنہ جب نظمائے کمپنی کی طرف سے تحریک ہوئی کہ مرہٹوں کی تالیفِ قلوب کے لئے عہد نامۂ بسین کی بعض شرائط بھی بدل دی جائیں اور پیشوا کے معاملات میں، جو انگریزوں کی سیادت سے اب بہت ناخوش نظر آتا تھا، دخل کم کردیا جائے تو بارلو نے شدّت سے مخالفت کی اور اپنے حقوق مداخلت میں ذرا بھی کمی کرنی پسند نہ کی[۵۴]۔

بارلو کے عہد کا ایک اور قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ ویلور (احاطۂ مدراس) کے ہندوستانی سپاہی بگڑ گئے اور انھوں نے اچانک قلعے پر حملہ کیا جہاں ٹیپو سلطان کے بیٹے گورہ فوج کی حراست میں تھے۔ گوروں کو شکست ہوئی اور وہ اور تمام انگریز افسر مارے گئے۔ باغیوں کا قلعے پر قبضہ ہوگیا لیکن بہت جلد ارکاٹ کی انگریزی سپاہ پہنچ گئی اور اس نے باغی سپاہیوں کو گرفتار کرلیا جنھیں سخت عبرتناک سزائیں دی گئیں ٹیپو سلطان کے بیٹوں کی اس فساد میں کوئی شرکت ثابت نہ ہوسکی۔ تاہم انھیں ویلور کا فساد

۵۱ اوکس ص صفحہ ۶۰۸

۵۲ ہلکر کے ساتھ جو صلح ہوئی اس کی قابلِ ذکر شرائط یہ تھیں کہ ہلکر آیندہ بندیل کھنڈ، ٹونک اور بوندی کی شمالی پر کوئی دعویٰ نہ رکھے گا چنبل کے جنوب میں ہلکر کے مقبوضات واپس دیدیئے جائیں گے، اور کمپنی انہیں کسی قسم کی مداخلت نہ کرے گی" (تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۳۰۹) ۵۳ اس زمانے میں ہندوستان کی آمدنی میں سے خرچ کے بعد جتنا روپیہ بچتا وہ سال کے سال نظمائے کمپنی کو ولایت بھیجدیا جاتا تھا (کین جلد اول ۲۰۴ وغیرہ)
۵۴ اوکس ص صفحہ ۶۰۹ ۔ اسیطرح حیدرآباد اور اودھ کے معاملات میں اس نے مداخلت کا موقع ہاتھ سے نہیں دیا اور "عہد معاونت" کی ایک ایک شرط کی سختی سے پابندی کرائی" (دیکھو کین جلد اول ۲۲۰)

یہاں سے ہٹا کر کلکتہ بھیج دیا گیا؛

انگریزی تواریخ کی عام روایت کے بموجب سپاہیوں کے بگڑنے کی اصلی وجہ یہ تھی کہ انہی دنوں احاطۂ مدراس کے فوجی محکمے نے ایک نئی وردی بنوائی تھی اور سپاہیوں کو ڈاڑھی مونچھ کی تراش خراش کے متعلق بھی بعض احکام صادر کیے تھے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ ماتھے پر تلک وغیرہ لگانے کی ممانعت کر دی تھی ان باتوں سے ہندوستانی سپاہی ناراض ہوگئے اور انھوں نے خیال کیا کہ انگریز ہمارا مذہب خراب کرنا چاہتے ہیں۔ اسی زمانے میں عیسائی پادری بھی ملک کے ہر حصے خاص کر مدراس و بنگال میں پھیلتے جاتے تھے۔ غرض انہی اسباب نے آخرکار سپاہیوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا؛ نظمائے کمپنی کو جب واقعات کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی حکومت مدراس سے ناخوش ہوئے اور وہاں کے گورنر اور فوجی سپہ سالار کو عہدے سے برطرف کر دیا۔ نیز بارلو کی جگہ لارڈ منٹو (اول) کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا جو بہت پختہ کار، وموقع شناس آدمی تھا؛

لارڈ منٹو نئے گورنر جنرل کے جولائی ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں عنان انتظام ہاتھ میں لینے کے کچھ عرصے بعد ریاست ٹراونکور میں انگریزوں کے خلاف وہ ہنگامہ ہوا جس نے ویلور کے مفسدے کی طرح ایک مذہبی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے انگریز ریزیڈنٹ کی ریاست کے معاملات میں مداخلت، فساد کی اصلی بنا تھی اور اسی مداخلت نے ریاست کے دیوان ویلو تامپی کو اس قدر مشتعل کیا کہ آخر اس نے بہت سے بلوائیوں کے ساتھ ریزیڈنٹ کی قیام گاہ پر حملہ کیا اور گو ریزیڈنٹ بال بال بچ کر نکل گیا لیکن تیس گورہ سپاہی بلوائیوں کے غیظ و غضب کا شکار ہوئے بعد میں یہ فساد بہت جلد رفع دفع کر دیا گیا لیکن قرینہ کہتا ہے کہ چند سال کے بعد پارلیمنٹ میں جو بحث چھڑی کہ پادریوں کو ہندوستان میں دین مسیحی کی تبلیغ کے واسطے جانے کی اجازت دی جائے یا نہ دی جائے اس میں زیادہ شدت انہی ویلور و ٹراونکور کے مفسدات سے پیدا ہوئی تھی۔ مگر آخر میں قرار پایا کہ تصدیق نامے (لائسنس) کے ساتھ پادریوں کو ہندوستان آنے کی اجازت دی جائے اور سرکاری طور پر ہندوستان میں ایک بشپ اور چند ماتحت پادریوں کا تقرر بھی منظور کر لیا گیا جن کی تنخواہیں

ہندوستان کے خزانے سے ادا کی جاتی تھیں ۔

ممالک غیر سے معاملات

ہندوستان کے اندرونی معاملات کا جہاں تک تعلق ہے لارڈ منٹو کے عہد حکومت کا اور کوئی واقعہ قابل ذکر نہیں نظر آتا۔ خود بھی اس کو سب سے زیادہ انہماک اس میں تھا کہ ممالک ایشیا سے فرانسیسی قوم کا اثر زائل کردے جو ابھی تک نپولین کے ماتحت اہل انگلستان سے برسرجنگ تھے۔ اسی غرض سے ایران، اور سندھ، کابل کو لارڈ منٹو نے سفارتیں روانہ کی تھیں مگر سندھ کے سوا، اور کہیں انگریزی سفیروں کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ جب دریائے ستلج کے جنوب کی سکھ ریاستوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سیادت قبول کرنے پر انگریزوں کی سیادت قبول کرنے کو ترجیح دی تو لارڈ منٹو نے خوشی سے ان کے تحفظ کا ذمہ لیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ سے یہ عہد و پیمان لے لیا کہ وہ آیندہ ان ریاستوں کے معاملات میں کوئی دخل نہ دے گا (عہد نامہ امرتسر ۱۸۰۹ء مطابق ۱۲۲۳ھ)

اسی زمانے میں بحر ہند میں فرانسیسیوں کے خلاف جو مہم انگلستان سے بھیجی گئی اس میں بھی لارڈ منٹو نے نمایاں حصہ لیا۔ افریقہ کے مشرق میں اکثر جزائر پر اہل فرانس کا قبضہ تھا اور لڑائی کے زمانے میں وہ وہاں سے نکل نکل کر انگریزوں کے تجارتی جہازوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح اُن دنوں مجمع الجزائر شرق الہند کے کئی جزیرے حکومت فرانس کے زیر نگین تھے اور ولندیزی آبادکاروں کی حیثیت محکومانہ رہ گئی تھی۔ اُن پر حملے کے وقت خود منٹو جزیرۂ جاوا کی لڑائیوں میں شریک تھا اور اگرچہ اہل فرانس نے وہاں کے شہروں کو نہایت مستحکم اور بہترین اسلحہ سے محفوظ کر رکھا تھا لیکن ہندوستان کی انگریزی فوجوں کے مقابلے میں ان کی کچھ پیش نہ گئی اور جزیرہ ملکا اور جاوا انگریزوں نے فتح کر لیئے (۱۸۱۱ء مطابق ۱۲۲۶ھ) مگر یورپ میں عام صلح کے وقت جاوا کو ولندیزیوں کے حوالے کر دیا گیا اور وہ اب تک انہیں کے قبضہ میں ہے

تجارتی اجارے کی تنسیخ

منٹو کی گورنر جنرلی کا ایک اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی اجارے کی میعاد ختم ہوئی کمپنی کے حصہ دار اس مدت میں توسیع مزید کے خواہاں تھے کہ ممالک ہند پر جو تسلط اور تجارت کا منافع انہیں حاصل ہے اس میں کوئی فرق نہ آئے لیکن انگلستان کے بعض اہل الرائے کمپنی کی ملکی حکومت اور

تجارتی اجارے دونوں کے خلاف تھے اور اس کو اہل ہند و برطانیہ کے حق میں نہایت مضر ثابت کرتے تھے۔ خود وزیر اعظم (لارڈ گرن ول) کا منشا تھا کہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات براہ راست حکومت انگلستان کے ماتحت کر لیئے جائیں مگر اہل انگلستان کی تجارت پسند طبائع کا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ نے حکومت کی ذمہ داریاں لینے سے تو انکار کر دیا البتہ ہندوستان میں کمپنی کو تجارت کا جو اجارہ حاصل تھا اس کی تنسیخ کر دی اور آیندہ سے ہر انگریز تاجر کو ممالک ہند میں بطور خود تجارت کرنے کا حق مل گیا۔

۳ منصوبۂ سیادت کی تکمیل

مارکوئس آف ہیسٹنگز

ارل اوف موئرا، جو ہندوستان کی جنگی خدمات کے صلے میں مارکوئس اوف ہیسٹنگز کا خطاب پا کر تاریخوں میں اسی خطاب سے مشہور رہے، جوانی میں انگلستان کا ایک بدنام امیرزادہ تھا اور جب اونسٹھ برس کی عمر میں کمپنی کے ہندی مقبوضات کا گورنر جنرل مقرر ہوا (۱۸۱۳ء مطابق ۱۲۲۸ھ) تو بقول مورخ ونسنٹ اسمتھ، اس بات کی کوئی امید نہ تھی کہ وہ آخر میں ہندوستان کے سب سے نامور گورنر جنرلوں میں شمار ہوگا اور نامور محض اتفاقی واقعات کا نتیجہ نہیں بلکہ درحقیقت ہیسٹنگز کی عمدہ انتظامی قابلیت جنگی مستعدی اور مشقت پسندی کا واجبی صلہ ہوگی۔ وہ کبھی گرمیوں میں پہاڑوں پر جا کر نہیں رہا۔ یہ بھی کبھی ایسا نہ ہوا کہ علی الصباح چار بجے لکھنے کی میز پر نہ آگیا ہو[۱] مگر ہیسٹنگز کے ذاتی حالات میں اس جگہ سب سے زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ ہندوستان کے متعلق اس کے سیاسی منصوبے بہت کچھ ولزلی کی مثل تھے اور ابتدا ہی سے وہ ارادہ کر چکا تھا کہ "اگر علانیہ نہیں تو اندرونی طور پر عملاً انگریزی حکومت کی ہند میں سیادت قائم" کر دی جائے[۲]۔

جنگ نیپال

ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا مقصد جنگ و جدال کے بغیر پورا نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اول تو ہندوستان کی بعض بڑی بڑی ریاستوں میں گو قوت نہ رہی تھی۔ پھر بھی قدیم

---

[۱] اوکس ہس - ۶۴۰

[۲] کین - جلد دوم صفحہ ۱۱

خودمختاری کی آن بان باقی تھی۔ دوسرے شمال میں پنجاب و نیپال کے علاقے جو ہمیشہ سے ملک ہند میں داخل سمجھے جاتے ہیں، انگریزی کمپنی کے دائرۂ اثر میں ابھی تک بالکل نہ آئے تھے۔ انہی میں سے ایک ریاست یعنی نیپال کے ساتھ ہیسٹنگز کی پہلی لڑائی ہوئی۔

لڑائی کی تفصیلی وجوہ کسی قدر مشتبہ ہیں مگر اصلی اور تہ کا سبب یہ ہے کہ جب ولزلی نے والی اودھ سے اس کے بہت سے اضلاع لے لیے (سنہ ۱۸۰۱ء) تو ان میں گورکھپور بھی تھا جس کی حدود ریاست نیپال کے علاقۂ ترائی سے ملی ہوئی تھیں اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ایک اجنبی اور طاقتور قوم کا اس قدر قریب آجانا گورکھوں کو ناگوار گزرا ہو اور انہی کی طرف سے لڑائی کی چھیڑ چھاڑ ہوئی ہو۔ منٹو کے زمانے تک ان سرحدی تنازعات کے متعلق خط کتابت ہوتی رہی بلکہ پہلی فروری سنہ ۱۸۱۴ء) کو خود ہیسٹنگز اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ ریاست نیپال سے جو اختلافات تھے وہ خیر و خوبی کے ساتھ طے ہو گئے[1] لیکن اس کے تھوڑے ہی دن بعد ہم ہیسٹنگز کو وسیع پیمانے پر جنگ کی تیاری میں مصروف پاتے ہیں۔ گویا اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ بزور شمشیر اہل نیپال کے دل پر کمپنی کی سطوت و قوت کا سکہ بٹھا دیا جائے۔

مناسب ہوگا کہ اس جنگ کے حالات ہم مورخ کین کی زبانی سنیں، جو قومی طرفداری کے باوجود جنگی واقعات کو واقفیت اور سلیقے سے تحریر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ دشمن کی ریاست چھوٹی سی تھی اور اس کی رعایا میں بیس لاکھ سے کچھ بہت زیادہ نفوس شامل نہ ہوں گے۔ تاہم اس کی حدیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ کھٹمنڈو سے ملاون کا فاصلہ سات سو میل سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوگا اور اس تمام خط پر گورنر جنرل نے، جو خود ہی سپہ سالار بھی تھا، فوج کشی کرنے کا ارادہ کیا۔ فوج کے اکٹھے چار حصوں (ڈویژن) سے اس چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھائی کی گئی اور ان انگریزی فوجوں کو توپ و تفنگ اور یورپی فن جنگ کے مطابق ہر قسم کے ساز و سامان سے مسلح کر دیا گیا کیونکہ موئرا کا ہمیشہ کا اصول یہ تھا کہ شروع ہی سے اپنی پوری قوت

---

[1] کین جلد دوم صفحہ ۱۲

کو اس مقام کے محاذ میں فراہم کر دیا جائے جس پر حملہ کرنا مقصود ہے تاکہ لڑائی کا فیصلہ جلد سے جلد ہو اور شروع میں پورا زور و زر صرف کرنے کی تلافی ہو جائے۔ سب سے بڑے جیش میں چوبیسویں نمبر کی گورہ فوج، چھ دیسی پلٹنیں، ہراول (یا پونیرز) اور توپچیوں کی مناسب تعداد، غرض کل ملا کر آٹھ ہزار کی جمعیت تھی اور جنرل مارلے (یا مارلی) کے ماتحت گورکھوں کے دارالحکومت کھٹمنڈو پر حملہ کرنا اسی جیش کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ تین دوسرے جیوش جنرل ووڈ، گلیسپی اور اوک ٹرلونی (اختر لونی) کے ماتحت سرحد پر پیشقدمی کر رہے تھے اور ان کی ترتیب دائیں طرف سے بائیں طرف وہی تھی جو جنرلوں کے ناموں کی ترتیب سے ظاہر ہے یعنی اوک ٹرلونی بائیں طرف سب سے آخری سرے پر تھا۔

اس زبردست حملے کو روکنے کے لئے گورکھے بارہ ہزار سے زیادہ باقاعدہ سپاہی فراہم نہ کر سکے تھے لیکن وہ بہت سے معرکے جیتے ہوئے۔ بڑے پختہ کار و جفاکش سپاہی تھے اور انھیں امر سنہا جیسا لائق و دور اندیش سپہ سالار ملا تھا۔ یہ شخص ذات کا "تھاپا" یعنی زراعت پیشہ لوگوں کے طبقے سے تھا اور گورکھوں کے دوسرے فوجی سردار بھی زیادہ تر اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

کالنگا کے معرکے

انگریزی فوج کی پیشقدمی کا اوک ٹرلونی اور گلیسپی نے آغاز کیا۔۔۔ جنگ کا جو نقشہ سوچا گیا تھا اس میں اوک ٹرلونی کا یہ تو کام تھا کہ وہ گورکھا فوج کے دائیں جانب بڑھے جہاں خود امر سنہا قیادت کر رہا تھا اور ملاؤں میں اس کا جنگی مستقر تھا۔ مگر ڈیرہ دون کو لے کر مغرب کی طرف یورش کرنا اور اوک ٹرلونی کو کمک پہنچانا گلیسپی کے سپرد ہوا تھا۔ ڈیرہ دون میں گورکھوں کی جو جمعیت سردار بال بہادر سنہا کے ماتحت متعین تھی، تعداد و قوت میں اسے ایک چھوٹی پلٹن کے مساوی سمجھنا چاہئیے۔ بال بہادر نے شہر سے کوئی چار میل شمال مشرق کی طرف ایک پہاڑی گڑھی کو اپنا مستقر بنایا تھا جو گردوپیش کی زمین سے تقریباً ایک ہزار فیٹ بلند ہے اور اس کی پہاڑی کے دامن میں موضع کالنگا واقع ہے۔ گلیسپی نے اوک ٹرلونی کی مدد کو بڑھنے سے پہلے اس گڑھی کو تسخیر کرنا ضروری سمجھا۔۔۔ اور اگر اس کے سپاہیوں کے دل میں بھی وہی آگ ہوتی جو گلیسپی کے سینے میں

بھڑک رہی تھی اور اگر ماتحت افسر اس کی قرارداد کے مطابق عمل کر اپنا اپنا فرض بجا لاتے تو گلیسپی کی تدبیر چل جاتی اور شاید جنگ چند ہفتے میں ختم ہو جاتی لیکن ان منصوبوں کے خلاف جو کچھ ظہور میں آیا وہ یہ تھا کہ انگریزی فوج کو شدید نقصان کے ساتھ ایسی ناکامیابی ہوئی جو سخت ذلت کے درجے تک پہنچی تھی۔ بہت سی قیمتی جانوں کے ساتھ خود جنرل گلیسپی کی جان بھی اسی میں ضایع ہوئی اور جنگ کا سلسلہ ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ بال بہادر نے انگریزوں کے تین حملے روکے اور ان معرکوں میں انگریزی سپہ سالار (جنرل گلیسپی) اور اور بہت سے افسروں کے علاوہ سپاہیوں کی اتنی بڑی تعداد کو تلوار کے گھاٹ اتارا جو اس کی مٹھی بھر گورکھا فوج سے کہیں زیادہ تھی۔ آخر کار جب گڑھی کے سامنے قلعہ شکن دبابہ لگایا گیا اور محصورین کا پانی بند کر دیا گیا تو اس وقت ان جانباز پہاڑیوں نے جو شمار میں صرف ستر رہ گئے تھے گڑھی خالی کر دی (۱۰ نومبر) کیونکہ اب اس میں ٹھیرنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی یہ جانباز صحیح سلامت بچ کر گڑھوال کی پہاڑیوں میں نکل گئے۔

اس افسوسناک ناکامی سے یہی نہیں کہ مغربی جیش کی پیشقدمی میں تاخیر واقع ہوئی بلکہ درحقیقت اسی نے گلیسپی کی فوج کے علاوہ دوسری مشرقی فوجوں کے سرداروں اور سپاہیوں کو بھی سخت بددل کر دیا۔ جو فوج مارلے کے ماتحت کھٹمنڈو کی طرف چڑھائی گئی تھی۔ اس کو نہایت ہی نااہل افسر ملے تھے اور ہر چند اس جیش کو صرف ستر میل کا فاصلہ طے کرنا تھا لیکن آگے بڑھنے کی بجائے مارلے جہاں تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا اور عذر یہ کیا کہ توپوں کی مزید تعداد آ جانے کا انتظار ہے۔ اس نے اپنے آگے بڑھے ہوئے دستوں کو بھی کافی مدد نہ پہنچائی اور جنوری ۱۸۱۵ء میں گورکھا فوج نے حملہ کر کے ان میں سے بعض دستے کاٹ دیئے جن میں بہت سے سپاہیوں اور انگریز افسروں کی جانیں گئیں۔ پھر تازہ کمک آنے پر اگرچہ مارلے کی فوج کی تعداد تیرہ ہزار تک بڑھ گئی اور دشمن کی سپاہ سے قریب قریب دس گنی ہو گئی تھی۔ باایں ہمہ مارلے نے قدم آگے نہ اٹھایا اور آخر اس قدر پست ہمتی دکھائی کہ دس فروری کو رات کے وقت تن تنہا گھوڑے پر چڑھ کر اپنے مستقر دانا پور کی طرف بھاگ آیا۔ اس کی جگہ کرنل ڈک ـــــ ۔ لی اور اس سے ایک عارضی

کامیابی ہوئی یعنی کھٹمنڈو کا راستہ انگریزی فوج کے لیئے صاف ہو گیا۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد جنرل وُڈ پہنچا مگر اس نے بھی مارلے سے کچھ زیادہ ہمت و مستعدی نہ دکھائی۔ خلاصہ یہ کہ گرمی آنے پر یہ جنٹیں گرمائی مقامات میں ہٹ آیا اور جنگ میں کوئی کار نمایاں انجام نہ دے سکا۔ اسی طرح دوسرے مشرقی جنٹیں کو جو وُڈ کے ماتحت تھا کئی زکیں پہنچیں اور وہ بھی ہٹ کر گورکھپور چلا آیا ۔

انگریزی افواج کی ان ناکامیوں نے، جیسا کہ پرنسپ اور دوسرے مورخوں نے صراحت کی ہے، ہندوستان میں ہر طرف انگریزوں کے خلاف شورش و فساد کے آثار پیدا کر دیئے تھے اور بہت سے انگریز اہل الرائے نیپال سے مصالحت یا جنگ موقوف کرنے کا جس طرح بھی ممکن ہو مایوسانہ مشورہ دینے لگے تھے لیکن ہیسٹنگز اپنے ارادے پر استقلال سے قائم رہا اور برسات کے ختم ہوتے ہی اس نے تازہ کمک اور ساز و سامان کے ساتھ فوج کشی کے احکام جاری کیئے۔ اس مرتبہ اس کے عزم و تدبیر کی قسمت نے بھی یاوری کی۔ اور اب گارڈنر نامی ایک انگریز کے مشورے سے خط جنگ کے اس مغربی سرے پر نیپالیوں کے مقابلہ میں حملہ کیا گیا جہاں علاقہ کماؤن کے پہاڑی باشندے نیپالی حکومت کے خلاف انگریزوں کے طرفدار بنا لیئے گئے تھے۔ گارڈنر پہلے مرہٹوں کی فوج میں نوکر تھا اور اسی زمانے میں جنرل لیک نے اس کو ضلع ایٹہ میں فوجی امداد کے عوض میں ایک جاگیر دلوا دی تھی گارڈنر کی تدبیر چل گئی اور ایک مرتبہ ناکامیابی کے بعد دوسری دفعہ الموڑا پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا جہاں کا سردار بام ساہ نہ گورکھالی قوم سے تھا نہ اس نے اپنا فرض ادا کرنے میں کچھ زیادہ مستعدی دکھائی ۔

الموڑے کی تسخیر نے گورکھا فوج کو دو حصّوں میں اس بُری طرح کاٹ دیا کہ پھر وہ اپنی مغربی سرحد پر خاطر خواہ مدافعت نہ کر سکے اور بالائی ستلج کی طرف سے اوک ٹرلونی کی پیشقدمی کا راستہ آسان ہو گیا ہلکر کے مقابلے میں اوک ٹرلونی کا پائے تخت دہلی کو دلیری سے بچانے کا حال ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ نیپال کی جنگ میں بھی اسی انگریز سپہ سالار کی ہمت و قابلیت سے فتح حاصل ہوئی اور امر سنگھ نے ملاؤن میں گھر کر ہتیار ڈال دیئے (مئی ۱۸۱۵ء مطابق ۱۲۲۹ھ) اسی طرح گورکھا

فوج کے کئی دستوں نے جابجا گھر کر انگریزوں کی اطاعت (اور پھر فوجی ملازمت) قبول کرلی۔[1]

مذکورۂ بالا واقعات نے دربارِ نیپال کو انگریزوں کی شرائطِ صلح ماننے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اسی اثنا میں اس ریاست کو سلطنتِ چین کی طرف سے مدد کی امید پیدا ہوئی اور وہ سابقہ قرارداد ماننے میں لیت و لعل کرنے لگی۔ لہٰذا اوکٹرلونی پھر اپنی فوج لے کر نیپال کے دارالحکومت پر بڑھا اور آخر کار مارچ ۱۸۱۶ء (۱۲۳۱ھ) میں عہدنامہ سگولی پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے کالی ندی کے مغرب میں گڑھوال، کماؤں اور ترائی کے کئی اضلاع نیپالیوں نے کمپنی کے حوالے کر دیئے اور کھٹمنڈو میں انگریز ریذیڈنٹ کا رکھنا منظور کرلیا جسے وہ معاہدے کی سب سے سخت شرط سمجھتے تھے۔[1]

پنڈاروں کا استیصال

جنگِ نیپال سے فرصت پانے کے بعد مارکوئیس آف ہیسٹنگز ہندوستان کے علاقوں میں اندرونی امن و امان اور نیز پوری طرح انگریزی سیادت قائم کرنے پر متوجہ ہوا۔ اس اندرونی امن و اماں میں سب سے زیادہ خلل پنڈاروں نے ڈالا تھا جن کی تعداد کثیر وسطِ ہند کے علاقے تاخت تاراج کرتی پھرتی تھی۔ اسی طرح ہلکر و سندھیا کی فوجوں نے راجپوتانہ میں سخت ہنگامہ مچا رکھا تھا اور وہاں کی ریاستوں پر آئے دن یورشیں کرتی رہتی تھیں۔ مگر یہ بے قاعدہ فوجیں اب برائے نام "مرہٹہ" رہ گئی تھیں ورنہ ان میں زیادہ تر شمالی ہند کے مسلمان سپاہی شریک تھے اور ان میں پٹھانوں کی تعداد غالب تھی جس کی وجہ سے اب ان سب کو عام طور پر انگریزی تاریخوں میں "پٹھان" لکھ دیا ہے اسی طرح "پنڈاروں" کا لفظ بھی خاص کسی قوم یا گروہ سے مخصوص نہیں بلکہ اس سے وسطِ ہند کے وہ لٹیرے مراد ہیں جنھوں نے اٹھارہویں صدی عیسوی (تیرھویں ہجری) کے آغاز میں نہایت خطرناک قوت بہم پہنچائی تھی اور جن میں ہندو مسلمان ہر قوم اور قریب قریب ہر علاقے کے لوگ شامل تھے۔ درحقیقت پنڈاروں کو لوٹ مار کی مشق مرہٹوں نے کرائی تھی اور ابتدا میں یہ لٹیرے انہی کی رفاقت میں بلکہ ہدایت سے کے

---

[1] مذکورۂ بالا حالاتِ جنگ کا ماخذ کین کی تاریخ جلد دوم (صفحات ۱۴ تا ۲۰) ہے نیز دیکھو ادکس صفحہ ۲۴ وغیرہ

[2] اس عنوان کی ذیل کے حالات گزسے ٹیئر جلد دوم (صفحات ۹۵ و ۳۹۹) اور ادکس فورڈ ہسٹری (صفحات ۶۲۵ تا ۶۲۹) سے ماخوذ ہیں۔

مطابق مختلف علاقے تاراج کرتے تھے لیکن جب مرہٹوں کے سرگروہوں نے اپنی ترک تازی چھوڑ کر مستقل ریاستیں قائم کرلیں تو گو پنڈاروں کے بعض سرداروں کو بھی مستقل جاگیریں مل گئیں لیکن ان کے زیادہ تر افراد ایسے تھے جن کا لوٹ مار کے سوا کوئی پیشہ او شغلہ نہ تھا۔ اور چونکہ ان کا نہ کوئی وطن تھا نہ صحیح معنی میں کوئی مذہب، لہٰذا ان کے اخلاق و اطوار کی حالت خراب تھی اور غالباً کوئی ایسی وحشیانہ سفاکی نہ ہوگی جس کا ارتکاب کرنے میں ان کو باک ہو۔

پنڈاروں کے اصلی مامن تو مالوے کے گھنے جنگلوں اور پہاڑوں میں تھے مگر انکی تاخت تاراج کا دائرہ بہت وسیع تھا اور سو سو دو دو سو سے لیکر بعض اوقات دس دس ہزار کے گروہوں میں وہ اپنے مقام سے نکل کر جدھر موقع ملتا حملہ کرکے ضلع کے ضلع پامال و خراب کرجاتے تھے۔ انگریزی تاریخوں میں **امیر خاں** کو بھی پنڈاروں کا سرگروہ بتایا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس گروہ میں قزاقی کی جو خصوصیات تھیں وہ امیر خاں میں نہ تھیں اس لئے پنڈاروں میں اسے شمار کرنا درست نہیں۔ پنڈاروں کے دوسرے سرگروہ ہونگ واصل، کریم اور چیتو مشہور ہیں اور ایک مرہٹے امباجی کا بھی جابجا نام آتا ہے جس نے جنوبی راجپوتانے میں آٹھ برس تک وہاں کے باشندوں کو لوٹا اور پریشان کیا۔

اگرچہ اب پنڈاروں کا مرہٹہ فوجوں سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا تھا کیونکہ اس قسم کی مرہٹہ فوجیں ہی رفتہ رفتہ غائب ہوگئی تھیں جن کے ساتھ پنڈاروں کا ہونا گویا قدرتی بات تھی تاہم وسط ہند کی بڑی بڑی مرہٹہ ریاستوں کی طرف سے پنڈاروں کو اب تک کچھ نہ کچھ مدد ملتی تھی اور چیتو علانیہ اپنے آپ کو راجہ سندھیا کا ملازم بتاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ہیسٹنگز کو ان قزاقوں کی سرکوبی میں خاص احتیاط اور جنگی تیاریاں کرنی پڑیں اور اس نے شمال و جنوب کی طرف سے ایک لاکھ بیس ہزار انگریزی فوج میدان میں اتاری۔ جس کے برابر تعداد میں اس وقت تک انگریزوں کی فوج کبھی فراہم نہ ہوئی تھی[۱]۔

مقاصد و تدابیر

یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان زبردست جنگی تیاریوں کی تہ میں دیگر مقاصد و مصالح بھی مضمر تھے

[۱] اس میں تیرہ ہزار کے قریب گورہ سپاہی اور تین سو توپیں تھیں۔

لیونہ ہیسٹنگز افواج کمپنی کی آراستگی اور فراہمی کے ساتھ ساتھ وسط ہند راجپوتانہ اور دکن کی قریب قریب تمام چھوٹی بڑی ریاستوں سے خط و کتابت کر رہا تھا کہ ہندوستان کے جو امیر و رئیس اب تک علیحدہ رہے ہیں وہ کمپنی کی سیادت تسلیم کر لیں اور جنھوں نے بادل ناخواستہ یہ سیادت تسلیم کی ہے ان کو اور زیادہ کمزور یا کم سے کم مرعوب کر دیا جائے۔ ان تدابیر میں خاصی کامیابی ہوئی۔ بھوپال، اودے پور، جودھپور اور کوٹہ کے رئیسوں نے کمپنی کی سیادت اور دوستی کو قبول کر لیا (۱۸۱۷ء)

باجی راؤ پیشوا اپنے پہلے عہد معاونت سے کچھ خوش نہ تھا۔ اس موقع پر اُس سے بھی مالوہ اور بندیل کھنڈ وباگر کو کن کا علاقہ اور ان حقوق سے دست برداری لے لی گئی جو بحیثیت پیشوا باجی راؤ کو دوسرے مرہٹہ رئیسوں پر حاصل تھے۔ (عہدنامہ پونا ۱۸۱۷ء) اس واقعے نے باجی راؤ کو انگریزوں کا سخت مخالف بنا دیا اور وہ بھونسلا راجہ کے ساتھ مل کر انگریزوں کی محکومی سے آزادی حاصل کرنے کا در پردہ ساز باز کرنے لگا۔

سندھیا، ہلکر اور امیر خاں سے انگریزوں کے نامہ و پیام جاری تھے اسلئے وہ پنڈاروں کی کوئی مدد وقت پر نہ کر سکے۔ پھر امیر خاں کو ریاست ٹونک دے کر خوش اور مطمئن کر دیا گیا۔ اور پنڈاروں کے باقی جتھوں کو انگریزی افواج نے گھیر گھیر کر جا بجا گرفتار یا ہلاک کیا۔

انگریزی مورخوں کا بیان ہے کہ چند مہینے کے اندر ان خوفناک قزاقوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ ان کے تین مشہور سرغنوں میں سے کریم نے انگریزوں کی اطاعت اور ضلع بستی میں ایک جاگیر یعنی قبول کر لی واصل خودکشی کر کے مرا اور چیتو کو اسیر گڑھ کے جنگلوں میں جہاں وہ بھاگ کر چھپا تھا، شیر نے پھاڑ کھایا۔

لیکن اس اثناء میں قرائن کے مطابق، زیادہ طاقتور حریف یعنی مرہٹہ رئیسوں سے لڑائی چھڑ گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ جنگ مرہٹہ میں ان رئیسوں کی قوت انگریزوں سے شکست کھانے اور باہمی نااتفاقی کی بدولت بہت کچھ کمزور ہو گئی تھی۔ بایں ہمہ اب تک ممالک ہند میں اگر کسی کے دل میں انگریزوں سے ہمسری کا دعویٰ اور اپنی آزادی کا جوش باقی تھا تو وہ یہی مرہٹہ رئیس تھے۔ اس بات کو انگریز اہل الرائے خوب سمجھتے تھے اور لارڈ ہیسٹنگز کے طرز عمل میں

مرہٹوں کے ساتھ جو کاوش چل رہی تھی اس کا ایک سبب بظاہر یہی تھا کہ اب اُسے اُن کی رہی سہی آزادی اور انگریزوں کے ساتھ ہمسری ناگوار گزرتی تھی۔

آخری جنگ مرہٹہ

الغرض پیشوا اور بھونسلا سے تو اس بنا پر کہ انھوں نے دھوکے سے انگریزی فوج پر حملہ کیا تھا۔ لڑائی چھڑی اور ہلکر سے مخاصمت کا سبب یہ قرار دیا گیا کہ اس نے پنڈاروں کے سرغنوں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ یہ اسباب جنگ بے بنیاد نہ تھے لیکن انصاف یہ ہے کہ عداوت و نزاع کی اصلی بنا وہ معاہدہ (عہدنامہ پونا) تھا جس پر باجی راؤ سے جبراً دستخط کرائے گئے تھے[1] باقی اندور پر انگریزوں کی فوج کشی کا اصلی سبب اس ہلچل اور بدنظمی کو قرار دینا چاہیے جو کہ جسونت راؤ ہلکر کی وفات (۱۸۱۱ء) سے اس ریاست میں پیدا ہو گئی تھی۔

بہرحال، جنگ میں ہر جگہ مرہٹوں کو شکست ہوئی اور انھیں کمپنی کے سامنے جس نے دیکھتے دیکھتے ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ قوت بہم پہنچا لی تھی سرنگوں ہونا پڑا۔ پیشوا باجی راؤ کو تو اس فوج نے جو خود اس کے خزانے سے تنخواہ پاتی تھی اور عہد معاونت کی رو سے انگریز افسروں کے ماتحت پونا کے قریب متعین تھی، دو شکستیں دے کر ملک سے باہر بھگا دیا اور خاندیس کے علاقوں میں مارے مارے پھرنے کے بعد آخر اس نے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی (جون ۱۸۱۸ء مطابق ۱۲۳۳ھ)۔ ناگپور کی مرہٹہ فوجوں نے اتنا بھی استقلال نہ دکھایا اور بلوائیوں کی طرح ایک حملہ کرنے کے بعد وہاں کے راجہ آپا صاحب اور اس کے سپاہیوں کا جوش فرو ہو گیا۔ اس کی فوج کے عرب سپاہی بطور خود کچھ روز تک مقابلہ کرتے رہے لیکن ایک منتظم قوت اور سلطنت کے مقابلے میں اس قسم کے ہنگامے کچھ دیرپا نہیں ہو سکتے۔ چند ہی ہفتے کے اندر یہاں بھی انگریزوں کو کامل غلبہ حاصل ہو گیا۔ (دسمبر ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۲ھ)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس تمام جنگ مرہٹہ میں سب سے سخت معرکہ جسونت راؤ

---

[1] جب تک انگریزی فوجوں نے (جن کی تنخواہ "عہد معاونت" کی رو سے خود پیشوا کو دینی پڑتی تھی) پونا کا محاصرہ نہ کر لیا، باجی راؤ انگریزوں کے مطالبات ماننے سے انکار کرتا رہا۔ بہ الفاظ دیگر اس نے مذکورہ بالا معاہدہ بالکل مجبور ہو کر کیا تھا (دیکھو تاریخ مرہٹہ جلد ثالث صفحہ ۳۰۵۔ نیز اوکس سن صفحہ ۶۲۹)

ہلکر کی فوجوں سے پیش آیا۔ حالانکہ اس راجہ کی وفات (۱۸۱۱ء) کے بعد وہاں صحیح معنی میں کوئی ایسا ذی اقتدار شخص نہ رہا تھا جس کی سب لوگ اطاعت کرتے۔ متوفی کا متبنی جانشین (ملہار راؤ) نابالغ لڑکا تھا اور اس کی جانب سے حکومت جسونت راؤ کی بیوہ رانی (تلسی بائی) کرتی تھی۔ اس جنگ کے موقع پر وہ انگریزوں سے مصالحت یا اطاعت پر مائل تھی لیکن فوج کے سرداروں نے اس کو قتل اور انگریزوں کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ انگریزی افواج سے ان کا خونریز مقابلہ مہدپور کے مقام پر ہوا (دسمبر ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۳ھ) جو اُجین سے کوئی بیس میل شمال میں واقع ہے آخر میں انگریزی فوج کو فتح ہوئی اور اس واقعے سے نہ صرف اندور کی ریاست بالکل قابو میں آگئی بلکہ سندھیا بھی مرعوب ہو گیا۔

اس طرح ۱۸۱۸ء (۱۲۳۳ھ) کے ختم تک نہ صرف پنڈاروں کا استیصال ہوا بلکہ تمام مرہٹہ رئیس کمپنی کے مطیع ہو گئے جس کے معنی یہ تھے کہ ممالک ہند میں سندھ و پنجاب ... اور نیپال و برما کے سوا کوئی طاقت ایسی نہ رہی جو انگریزوں کی سیادت کو تسلیم نہ کرتی ہو اور ان چار میں بھی جو آزاد رہیں نیپال و برما صحیح معنی میں ہندوستان کے اندر داخل نہیں؛ اور شمالی پنجاب و سندھ بھی گزشتہ زمانے میں ہندوستان خاص کے باہر سمجھے جاتے تھے۔ بہرحال، ان چار علاقوں کو چھوڑ کر ہند و دکن کے باقی سب علاقے بالواسطہ یا بلاواسطہ انگریزی کمپنی کے زیر نگیں آ گئے۔ گویا ولزلی کے منصوبے کی ہیسٹنگز نے تکمیل کر دی۔

اہم نتائج

اُن تمام معاہدات کا ذکر کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں جو اس موقع پر ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے کیے گئے تھے۔ اجمالاً صرف جنگ مرہٹہ کے یہ اہم نتائج بیان کرنے کافی ہوں گے کہ (باجی راؤ) پیشوا کو وظیفہ دے کر کانپور بھیج دیا گیا اور اس منصب کے خاتمے کے ساتھ اس کی تمام ریاست پر، بہ استثنائے ضلع ستارا، انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ ستارا میں سیواجی کے قدیم خاندان کے وارث کو رئیس مان لیا گیا تھا لیکن اس ریاست کو بھی چند سال بعد لارڈ ڈلہوزی نے ضبط کر لیا جس کا حال ہم آگے پڑھیں گے۔ اسی طرح بھونسلا خاندان کے پاس صرف ناگپور کے چند اضلاع چھوڑ کر باقی پورے علاقے پر

ہیسٹنگز نے قبضہ کر لیا۔ ہلکر کی ریاست کے کئی ضلع مستقل طور پر لے لیئے گئے اور ملہار راؤ کی نابالغی کے زمانے تک باقی علاقہ بھی وہاں کے انگریز ریزیڈنٹ کے زیر حکومت رہا۔

راجپوتانے کا کوئی بڑا علاقہ ہیسٹنگز نے لینا پسند نہیں کیا مگر یہاں کی ریاستوں سے جو معاہدے ہوئے ان میں کمپنی کو راجپوت ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کرنے کا حق مل گیا اور قریب قریب اسی اصول پر وسط ہند کی دوسری ریاستوں سے معاہدے کر لیئے گئے۔ اسی ضمن میں کچھ کی ریاست کا بھی ذکر کر دینا چاہیئے جہاں کے رئیس نے پہلے کمپنی سے اتحاد و دوستی کا عہد کر لیا تھا لیکن بعد میں انگریزوں کی مداخلت سے تنگ آکر جنگ پر آمادہ ہوا اور ہیسٹنگز نے ایک فوج بھیجکر اسے شکست دی۔ راجہ نے اطاعت قبول کر لی تھی مگر ہیسٹنگز نے اسے معزول کر دیا اور اس کے صغیر سن بیٹے کی جانب سے حکومت انگریز ریزیڈنٹ کو سونپ دی۔ (سنہ ۱۸۱۹ء)

قبضہ سنگاپور

لارڈ ہیسٹنگز کے عہد کا ایک اور قابل ذکر واقعہ قبضہ سنگاپور ہے جو ان دنوں ایک چھوٹا سا مچھیروں کا جزیرہ تھا اور اب سلطنت برطانیہ کی مشرقی تجارت اور بحری قوت کا مرکز بن گیا ہے۔ دراصل نپولین بونا پارٹ کی آخری شکست و قید کے بعد جب جاوا دوبارہ ولندیزوں کو مل گیا (سنہ ۱۸۱۵ء) تو جزائر شرق الہند اور چین و جاپان سے بحری تجارت کے تمام راستے انہیں ولندیزوں کے زیر اقتدار آگئے اور اسی کی تلافی کے لیئے ہیسٹنگز نے نظماء کمپنی کی پسند و ناپسند کا لحاظ کیئے بغیر جزیرہ مذکور پر قبضہ کر لیا اور ولندیزوں کی ناراضی کی بھی چنداں پروا نہ کی۔ سنگاپور کی بعد کی ترقی اور موجودہ اہمیت ہیسٹنگز کے عمدہ انتخاب اور دور اندیشی کا بدیہی ثبوت ہے۔

مختلف واقعات

لارڈ ہیسٹنگز کے جس طرح عملاً کمپنی کی سیادت ہندوستان میں قائم کی اسی طرح وہ چاہتا تھا کہ وہ قدیم رسمیں بھی ترک کر دی جائیں جو کمپنی کی اس جدید سیادت و منزلت کے منافی تھیں۔ چنانچہ گو شاہ عالم بادشاہ کے نام کا سکہ سنہ ۱۸۳۵ء (سنہ ۱۲۵۰ھ) تک ضرب ہوتا رہا لیکن خاص خاص درباری موقعوں پر کمپنی کی طرف سے جو نذریں دی جاتی تھیں۔ وہ ہیسٹنگز نے موقوف کر دیں۔ یوں بھی شاہ عالم کے بعد "شاہ دہلی" کی حیثیت کمپنی کے معمولی وظیفہ خوار کی سی ہوتی جاتی تھی اور "قلعہ معلیٰ" جہاں ایک زمانے میں

ہندوستان کی قسمت کے فیصلے ہوا کرتے تھے۔ اب محض کسی امیر کی حویلی رہ گیا تھا تو شاہِ دہلی سے رسمی اعزاز کو لم کرنے کی ایک اور تدبیر یہ کی گئی کہ نواب وزیر والئی اودھ اور نواب نظام الملک آصفجاہ کو ہیسٹنگز نے لقب بادشاہی اختیار کرنے پر آمادہ کیا لیکن باوفا چین قلیچ خاں کی اولاد نے ایسی عزت قبول نہ کی جس میں شکستہ حال شاہانِ دہلی کی اہانت کا پہلو مضمر تھا۔ البتہ والئی اودھ نے جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں، یہ لقب اختیار کر لیا۔[۱]

ہیسٹنگز کے دیگر ملکی انتظامات کا بھی اسی مقصد کمپنی کی حکومت کو مضبوطی سے ہندوستان میں قائم کرنا نظر آتا ہے۔ یہ طریقہ کہ ضلع کے محصّل یا کلکٹر کو وسیع انتظامی اور فوجداری اختیارات دیدیئے جاتے ہیں ہیسٹنگز ہی نے جاری کیا تھا اور اب تک یہی طریقہ زیرِ عمل ہے! اسی طرح "رعیت واری" بندوبست کو بھی ہیسٹنگز کے زمانے میں بڑی وسعت دی گئی جس میں "زمیندار" یا "جاگیردار" کا رعیت سے واسطہ ہٹا کر سرکار براہِ راست کاشتکاروں سے سرکاری لگان وصول کرتی ہے۔ ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں رعیت سے بلاواسطہ لگان وصول کرنے کا طریقہ مدت سے رائج تھا لیکن سلطنت کی طرف سے بالعموم بڑے بڑے موروثی زمیندار دیہات کے مالک قرار دیدیئے جاتے تھے اور زمین کی پیداوار یا مالگزاری میں پہلا حق انہی زمینداروں کا ہوتا تھا۔ رعیت واری طریقے میں فائدہ یہی نظر آتا ہے کہ زمیندار کا حق بھی سرکار ہی کو مل جاتا ہے اور اس لیئے وہ مالگزاری بڑھا سکتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ہر کاشتکار سے وصولِ مال کے لیئے سرکار کو ملازمین کا عملہ بڑھانا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سرکاری ملازمین کاشتکاروں سے وہ ہمدردی اور انکی مختلف ضروریات سے اتنی واقفیت نہیں رکھتے جو اُن کے مقامی اور موروثی زمینداروں کو ہو سکتی ہے اور اس کا نتیجہ عام طور پر زراعت اور اہلِ زراعت کے حق میں اچھا نہیں نکلتا۔ چنانچہ ہیسٹنگز کے زمانے میں جب کمپنی کے نئے مقبوضات میں رعیت واری بندوبست ہوا تو اوّل تو مالگزاری کی شرح بہت بڑھا چڑھا کے تشخیص کی گئی دوسرے اس کے وصول کرنے میں بعض مقامات کی رعایا پر ناگفتہ بہ

---

[۱] اوکس ہس صفحہ ۱۷۶

سختیاں ہوئیں[۱]۔ آخرکار تقریباً تیس برس کے بعد ہیسٹنگز کی قرارداد شرح مالگزاری کو گھٹانا پڑا۔ پھر بھی ہندوستان کے جن صوبوں میں یہ رعیت واری طریقہ رائج ہے وہاں کے زراعت پیشہ باشندوں کی حالت بالعموم دوسرے صوبوں کے زمینداری نظام سے گری ہوئی ہے۔

---

[۱] اوکسا ہس صفحہ ۶۴۵ وغیرہ

باب پنجم

مزید مقبوضات اور آغاز بادشاہی

۱۔ بعض اندرونی اصلاحات اور بیرونی لڑائیاں

مارکوئیس آف ہیسٹنگز کے جانے کے بیس اکیس برس بعد تک ہندوستان میں انگریزی حکومت کو کوئی بڑی لڑائی پیش نہیں آئی۔ اور برما یا افغانستان کی جنگ بیرون ہندوستان کی لڑائیاں ہیں۔ یوں بھی اس عرصے میں ولیم بنٹنک کے سوا کوئی ایسا گورنر جنرل مقرر نہ ہوا جو اپنی قابلیت کا نقش چھوڑ جاتا۔ غرض اس زمانے کی تاریخ مختلف غیر مسلسل واقعات کا غیر دلچسپ سا مجموعہ رہ گئی ہے اور ہمیں ان واقعات کو علیحدہ علیحدہ مختصر طور پر بیان کر دینا ہی کافی ہوگا۔

ہندوستان سے جاتے وقت (جنوری ۱۸۲۳ء مطابق ۱۲۳۸ھ) ہیسٹنگز کونسل کے سب سے بڑے رکن کو اپنا جانشین بنا گیا تھا اور لارڈ ایمہرسٹ کے آنے تک (اگست ۱۸۲۳ء) وہی حکومت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ایمہرسٹ کے عہد حکومت (۱۸۲۳ء تا ۱۸۲۸ء مطابق ۱۲۴۴ھ) کا سب سے مشہور واقعہ پہلی جنگ برما ہے جو انگریزی روایتوں کے بموجب حکومت برما کی دست درازی کی وجہ سے چھڑی۔ پہلی جنگ برما

واضح ہے کہ اراکان پر برما کے راجہ کا بہت سال پہلے قبضہ ہو چکا تھا اور اس کی سرحدیں جنوب مشرقی بنگال سے متصل ہیں لیکن چند ہی سال پہلے ریاست آسام میں خانہ جنگی ہوئی اور جب متخاصمین انگریزی امداد نہ حاصل کر سکے تو بعض نے حکومت برما سے اعانت کی درخواست کی جس کا آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ خود اہل برما آسام پر قابض ہو گئے (۱۸۱۷ء) اور اسی وقت سے ان کے انگریزوں کے ساتھ آئے دن سرحدی جھگڑے رہنے لگے لیکن جب کمپنی کو ہندوستان کی لڑائیوں سے فرصت ہوئی اور مصالحانہ گفتگو سے خاطر خواہ کام نہ چلا تو برما کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔

(مارچ ۱۸۲۴ء مطابق ۱۲۳۹ھ) اور انگریزی افواج نے آسام پر بری اور جنوبی برما پر بحری حملہ کیا۔ آسام کا بری حملہ بعض ناکامیوں کے بعد کامیاب ہوا لیکن جنوبی برما کی لڑائی میں خلاف امید بہت طوالت ہوئی اور شہر رنگون پر انگریزی قبضہ ہو جانے کے باوجود اہل برما استقلال و ہمت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ آخر اپریل ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) میں ان کا لائق سپہ سالار مہابندولا مارا گیا جس سے برمی فوج کی ہمت پست ہوگئی اور پھر وہ پایۂ تخت آوا پر انگریزوں کی پیشقدمی کو نہ روک سکی حملہ آور مقام ینڈبو تک بڑھ آئے جہاں سے پایۂ تخت آوا صرف چار منزل دور رہ جاتا ہے اور اسی مقام ینڈبو کی شرائط طے ہوئیں (عہد نامہ ینڈبو فروری ۱۸۲۶ء مطابق ۱۲۴۱ھ) حکومت برما نے آسام اور اراکان کا ملک اور ساحل تناسرم حملہ آوروں کے حوالے کیا اور ایک کروڑ روپیہ تاوان جنگ دینا قبول کر لیا جس کے بعد انگریزی فوجیں رنگون اور جنوبی برما سے واپس ہٹ آئیں۔

ایمہرسٹ کے عہد کا ایک اور مشہور واقعہ بھرتپور کی تسخیر ہے (۱۸۲۶ء) اس ریاست نے ہیسٹنگز ہی کے زمانے سے انگریزی سیادت قبول کر لی تھی لیکن جب راجہ کی وفات پر دہلی کے انگریزی رزیڈنٹ نے اس کے صغیر سن بیٹے کو وارث قرار دیا تو متوفی راجہ کے بھائی نے یہ تجویز نامنظور کی اور اپنی جانشینی کا اعلان کر دیا جنگ برما کی ابتدائی ناکامیوں اور پریشانیوں کی وجہ سے اول اول ایمہرسٹ بھرتپور پر فوج کشی کے خلاف تھا لیکن ۱۸۲۶ء میں رضامند ہو گیا اور انگریزی سپہ سالار لارڈ کومبرمیر نے بھرتپور کا محاصرہ کر لیا۔ انگریزی توپوں کی گولہ باری اس مرتبہ بھی قلعے کا کچھ نہ بگاڑ سکی تو محاصرین فصیل تک سرنگ لگانے میں کامیاب ہوگئے اور بارود بھر کے فصیل کا ایک حصہ اڑا دیا۔ پھر انگریزی فوج نے یورش کی اور قلعہ بھرتپور تسخیر ہو گیا۔[1]

لارڈ ولیم بنٹنگ ایمہرسٹ کا جانشین۔ لارڈ ولیم بنٹنگ انگلستان کے شاہی خاندان سے تھا اور پہلے احاطۂ مدراس کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ مدراس میں اس کا عہد حکومت

[1] چونکہ لارڈ لیک کے زمانے میں اس قلعے کا محاصرہ اور انگریزی افواج کی ناکامی مشہور ہو گئی تھی لہذا اکثر انگریز اس کی تسخیر کو گذشتہ بدنامی رفع کرنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور غالباً اسی جوش و کد کا اثر تھا کہ فتح کے بعد راجہ کے محلات کو بہت بے دردی سے لوٹا گیا اور قلعے کو تڑوا کے زمین کے برابر کرا دیا گیا! (دیکھو مارشمین کی تاریخ ہند (ملخص) صفحہ ۴۵۶۔ اور کس ص ۶۵۳ وغیرہ۔

کامیاب نہیں رہا لیکن غالباً خاندانی وجاہت اور خود بن ٹنک کے اصرار سے نظمائے کمپنی نے اسے گورنر جنرل بنانا منظور کرلیا اور وہ ماہِ جولائی ۱۸۲۸ء (۱۲۴۳ھ) میں دوبارہ ہندوستان بھیجا گیا۔

بن ٹنک کے اکثر ہندوستانی اہل الرائے اور سنجیدہ انگریز مورخ مداح ہیں اور اسے اہل ہند کا بہی خواہ اور محسن سمجھتے ہیں لیکن بعض انگریز مصنفوں نے اسکی مذمت کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اپنے انگریز ماتحتوں میں بھی وہ بہت غیر ہر دلعزیز تھا۔ اس ناراضی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ شوقِ جنگ و ملک گیری سے خالی تھا اور نظمائے کمپنی کی ہدایت کے مطابق ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں دخل دینے سے بالعموم احتراز کرتا رہا لیکن ایک اور سبب جس نے اس کے ماتحت انگریز عہدہ داروں کو ناراض کیا یہ تھا کہ بن ٹنک نے انکی آمدنی کے بعض ذرایع (فوجی بھتہ وغیرہ) کم کردیئے اور ان کے کام پر سختی سے نگرانی قائم کی۔

مگر یہ مالی اصلاحات یا کفایت شعاری درحقیقت نظمائے کمپنی کی ہدایت کے مطابق عمل میں لائی گئی تھی جن کو جنگ برما نے پھر زیربار اور پریشان کر دیا تھا۔ اسی کفایت کے ساتھ بن ٹنک نے سرکاری مدخل میں بھی مختلف اضافے کیئے۔ خاص کر افیون کے تجارتی اجارے کا معاوضہ بہت بڑھا دیا اور اسی ضمن میں ہندوستانیوں کو کثرت سے سرکاری ملازمتیں دیں۔ سابق میں اکثر انگریز گورنر جنرل اہل ہند کی دیانت و قابلیت کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے لیکن بن ٹنک کو ذاتی طور پر اس قسم کا تعصب نہ تھا اور سیاسی اعتبار سے بھی وہ اہل ہند کو ملازمت دینا عین دور اندیشی اور کفایت شعاری جانتا تھا کیونکہ دیسیوں کو اتنی کم تنخواہ دی جاتی تھی کہ اس مشاہرے پر اتنے کارگزار انگریزوں کا ملنا محال تھا۔

نئے مقبوضات

عدم مداخلت کی حکمت عملی پسند کرنے کے باوجود بن ٹنک کے زمانہ میں بھی کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ ہوا یعنی مختلف وجوہ سے مشرقی بنگالے کی دو چھوٹی ریاستوں میں کمپنی کی عملداری قائم کر دی گئی اور اسیطرح کورگ پر فوج بھیجکر اس ریاست کا الحاق کرلیا گیا (۱۸۳۴ء مطابق ۱۲۴۹ھ) کہتے ہیں کہ یہاں کا راجہ نہایت ظالم خونخوار تھا اور انگریزوں سے سخت عداوت رکھتا تھا

جب فہمائش سے کام نہ چلا اور لڑائی میں یہ راجہ گرفتار ہوا تو اُس کے خاندان میں اور کوئی مرد نہ تھا جسے جانشین بنایا جاتا۔ لہٰذا یہ ریاست ضبط کرلی گئی ؎

ستی اور ٹھگی کا انسداد

لیکن ولیم بن ٹنگ کا سب سے مشہور کارنامہ ستی کا انسداد ہے۔ ہندوستان کے ہندوؤں میں یہ رسم بہت قدیم سے جاری تھی۔ اکبر نے اپنے عہد بادشاہی میں اُسے روکنے کی کوشش کی اور یہ قانون بنا دیا تھا کہ کسی بیوہ کو ستی ہونے پر مجبور نہ کیا جائے مگر اکبر یا دوسرے مسلمان بادشاہ ہندوؤں کی مذہبی رسوم میں مداخلت کرنا اصولِ حکومت کے خلاف جانتے تھے لہٰذا اگر کوئی بیوہ اپنے مُردہ شوہر کے ساتھ خوشی سے جلنا چاہے تو اسے نہ روکا جاتا تھا اور کمپنی کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ خوفناک رسم جاری رہی بعض انگریز حکام کو اس کے انسداد کا خیال آیا بھی تو وہ عملاً کچھ نہ کرسکے اور ہندوؤں کی ناراضی کے اندیشے سے خاموش رہے۔ خود لارڈ ولیم بن ٹنگ کو عرصے تک اس قسم کا انسدادی قانون بنانے میں تامل رہا اور اُس نے خاص طور پر ہندو سپاہیوں کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ آخر جب انگریز افسروں نے اُسے اطمینان دلایا کہ ہندو سپاہیوں کے بگڑنے کا اندیشہ نہیں اور اسیطرح دوسرے عہدہ داروں نے گورنر جنرل کے خیال کی تائید کی تو اس نے وہ ''آئین'' (ریگولیشن) جاری کیا جو ''آئینِ ہفدہم مجریہ ۱۸۲۹ء'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی رُو سے بیوہ عورتوں کو جلانا یا زندہ دفن کرنا جرم اور سزائے موت کا مستوجب قرار دیا گیا۔ اور اعلانِ عام کر دیا گیا کہ جو لوگ اس کام میں شریک ہوں گے وہ ''مردم کشی'' اور بعض صورتوں میں ''قتلِ انسان'' کے مجرم سمجھے جائیں گے۔

یہ قانون اوّل اوّل احاطۂ بنگال میں نافذ ہوا تھا بعد میں مدراس و بمبئی کی مقامی حکومتوں نے اور پھر بعض دیسی ریاستوں نے بھی اسی کو خفیف ترمیم و تغیر کے ساتھ اپنے علاقوں میں جاری کر دیا اور رفتہ رفتہ ستی کی رسم ہندوستان سے اُٹھ گئی۔ غیر آباد مقامات میں یا درپردہ اس قسم کی کارروائی ہوتی رہی ہو تو وہ کسی شمار میں نہیں کیونکہ ستی یا ستی کی طرح دوسری خوفناک رسموں کی بعض مثالیں اب تک کبھی کبھی سننے میں آتی ہیں ؎

لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد کا ایک اور کارنامہ "ٹھگی" کا انسداد ہے۔ جس کے متعلق انگریزوں میں عجیب عجیب افسانے مشہور تھے اور ٹھگوں کی قدامت اور ہمہ گیر قوت و اثر پر انگریزی میں مستقل کتابیں تصنیف ہوئی تھیں۔ کہتے ہیں یہ لوگ کالی یا بھوانی یا درگا دیوی کو پوجتے تھے اور ان کا تمام ہندوستان میں جال پھیلا ہوا تھا۔ ان کے باقاعدہ "جرگے" تھے جن میں لوگوں کو پکڑنے اور گلا گھونٹنے کا کام اس فن کے خاص ماہروں کے سپرد ہوتا تھا اور باقی شرکا میں سے بعض قبر کھودنے اور بعض جاسوسی کرنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ مگر ٹھگوں کی اصلی شہرت اور کمال "گلا گھونٹنے" ہی میں تھا کہ وہ رہ گیر یا مسافر کے قریب پہنچ کر یک بہ یک رومال کا پھندا گلے میں ڈال لیتے اور آن واحد میں آدمی کا کام تمام کر دیتے تھے۔ لوگوں کو طرح طرح کے فریب دے کر لوٹنا یا مسافروں کو راستے سے بھٹکا کر اپنے جال میں پھانسنا ٹھگوں کا خاص ہنر تھا اور اس میں شک نہیں کہ وسط ہند میں ٹھگی ایک موروثی پیشہ بن گئی تھی۔ بعض انگریز عہدہ داروں کی تحریک سے ولیم بنٹنگ اس گروہ کے استیصال پر آمادہ ہوا اور اس نے "انسداد ٹھگی و ڈکیتی" کے نام سے ایک جداگانہ محکمہ قائم کیا جو ہمارے زمانے تک بھی قائم تھا۔ اسے ایک قسم کی ہنگامی پولیس سمجھنا چاہیے جس کا خاص کام ٹھگوں اور ڈکیتوں کا سراغ لگا کر گرفتار کرنا تھا اور اندازہ کیا گیا ہے کہ خود ولیم بنٹنگ کے زمانے میں اس محکمے کی کوشش سے دو ہزار کے قریب ٹھگ پکڑے گئے اور انھیں قید یا پھانسی کی سزائیں ملیں[1]۔

زوالِ شاہی کی تمہید

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کا اجارہ ۱۸۱۳ء میں منسوخ ہو چکا تھا لیکن عام تجارت و حکومت کی جو اجازت ملی اس کی میعاد بھی صرف بیس سال رکھی گئی تھی اور وہ ۱۸۳۳ء (۱۲۴۸ھ) میں ختم ہوئی۔ لہٰذا اس سال، انگلستان میں بہت بحث و مباحثے کے بعد، بیس سال کے واسطے پھر مذکورہ بالا حقوق کی تجدید کی گئی اور چونکہ اس مرتبہ چین کی تجارت کا اجارہ بھی منسوخ ہو گیا۔ لہٰذا اب کمپنی کی حیثیت تاجر کے بجائے مستاجر کی سی رہ گئی جسے خاص خاص شرائط کے ساتھ ملکی مقبوضات میں حکومت کا

[1] مارشمن ہسٹری (خلاصہ) صفحہ ۔ ۴۷۷

حق دیدیا گیا تھا مگر فرمان شاہی کی اس تجدید کے موقع پر اصولِ حکومت میں بہت سی
قابل ذکر تبدیلیاں ہوئیں اور اول تو گورنر جنرل کے اختیارات دوسرے عہدہ داروں سے
بڑھا دیئے گئے دوسرے اُسے ممالک ہند کیلئے قوانین بنانے کا پورا حق
حاصل نہ تھا۔ اسی ضمن میں گورنر جنرل کی کونسل میں شعبۂ قوانین کے واسطے ایک رکن
(لا ممبر) کا اضافہ ہوا اور اس خدمت پر سب سے اول اس زمانے کا مشہور ادیب و
انشا پرداز میکالے مقرر ہوا۔

جدید فرمان شاہی یا پارلیمنٹ کے اس قانون کی دفعہ ۸۷ بھی بہت مشہور ہے
جس میں صاف صاف الفاظ میں اعلان کیا گیا تھا کہ ممالک ہند کا کوئی باشندہ،
محض اختلاف مذہب وقومیت یا اختلافِ رنگ ونژاد وبوم کی وجہ سے کمپنی کی
کسی ملازمت یا کسی عہدے سے محروم نہ کیا جائے گا" یہی وہ اصول یا وعدہ ہے جس کی
بعد کے شاہی اعلانات میں تصدیق وتجدید ہوتی رہی اور اکثر انہی اعلانات کی بنا پر
اہل ہند کے سیاسی سرگروہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کا
مطالبہ کرتے رہے ہیں۔

انگریزی تعلیم کا آغاز

مذکورۂ بالا اصول، اور کاروبارِ حکومت کی روزافزوں ضروریات کا نتیجہ یہ ہوا کہ
اب کمپنی کی حکومت ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا رواج دینے پر آمادہ ہوگئی تاکہ
اسے انگریزی داں ملازم آسانی سے مل سکیں۔ ہندوستانیوں کو اعلیٰ مغربی تعلیم
دینے کے بہت سے انگریز اہل الرائے مخالف تھے اور بعض کی یہ رائے تھی کہ اگر
انگریزی حکومت اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرے تو وہ اسی قدیم طرز کی عربی اور سنسکرت علوم
کی تعلیم ہو جس کا ہندوستان میں پہلے سے رواج تھا۔ اس بحث میں جرائد وکتب کے
ہزاروں ورق سیاہ ہوئے اور انگلستان وہندوستان میں بڑی بڑی موشگافیاں کی گئیں۔
لیکن یہ درحقیقت بہت کچھ محض نظری مباحث تھے اور قیاسی نتائج نکالنے کی دھن میں اکثر
بحث کرنے والے کمپنی کی عملی ضروریات کو بھول جاتے تھے۔ غرض مخالفین کی کچھ
پیش نہ گئی اور بن ٹنگ کے عہد ۱۸۳۵ء میں اسی "انگریزی طرز تعلیم کی بنیاد پڑگئی جو
ہمارے زمانے تک رائج ہے۔ اس کے رواج دینے میں انگریزی حکومت کو سب سے
زیادہ مدد پادریوں سے ملی۔ جو اپنے نزدیک مغربی علوم کی ترویج کو دین مسیحی کی اشاعت

کا نہایت عمدہ اور یقینی ذریعہ سمجھتے تھے۔

اوک لینڈ

لارڈ ولیم بنٹنک ماہ مارچ ۱۸۳۵ء (۱۲۵۰ھ) میں ملازمت سے دستکش ہو کر ولایت چلا گیا اور ایک سال تک سر چارلس مٹکاف نے عہدہ گورنر جنرل کے فرائض انجام دیے لیکن اخبارات کو آزادی دینے کی بدولت نظمائے کمپنی اُس سے ناخوش ہو گئے اور اس نے استعفا دینے پر انھوں نے لارڈ اوک لینڈ کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا (مارچ ۱۸۳۶ء، ۱۲۵۱ھ) جو انگلستان کے اُمرا میں بہت اعتدال پسند اور معاملہ فہم آدمی سمجھا جاتا تھا۔ مگر جنگِ افغانستان کی ناکامی کے باعث اس کی بڑی بدنامی ہوئی اور اب تک بعض انگریز مورخ اس کی ہجو کرتے ہیں۔[۱]

معاملات افغانستان

لیکن انصاف سے دیکھئے تو لارڈ اوک لینڈ یا ہندوستان کے انگریز حکام افغانستان کے معاملات میں اس جنگ کے اتنے ذمہ دار نہیں جس قدر کہ انگلستان کی حکومت جو وسط ایشیا میں روسیوں کا روز افزوں اقتدار دیکھ دیکھ کر بہت خائف ہو گئی تھی چنانچہ وزیر خارجہ کی طرف سے (نظمائے کمپنی کی معرفت) لارڈ اوک لینڈ کو ہندوستان پہنچتے ہی تحریک ہوئی تھی کہ جہاں تک ہو سکے وہ روسیوں کو دربار کابل میں رسوخ نہ حاصل کرنے دے اور نیز ایرانیوں کو جو ان دنوں روس کے حلیف ہو گئے تھے ہرات پر قبضہ کرنے سے تا امکان روکنے کی کوشش کرے۔

ان ہدایات کی بنا پر بعض انگریز مصنفوں نے انگلستان کے وزیر خارجہ (لارڈ پامرسٹن) پر سخت نکتہ چینی کی ہے کہ شاید وہ اتنا جغرافیہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ہرات و ستلج کے درمیان جو فاصلہ ہے اس کی درازی کا صحیح اندازہ کر لیتا۔ اسی طرح انھوں نے اوک لینڈ کو ان ہدایات کی تعمیل پر بہت کچھ برا بھلا کہا ہے اور لکھا ہے کہ اگر واقعی روسیوں کا اثر ہرات و کابل تک پہنچ جاتا تو بھی کمپنی کے مقبوضات کی سرحد اُن دنوں ستلج سے آگے نہ بڑھی تھی اور اس کے اور افغانستان کے درمیان ایک طرف پنجاب اور دوسری طرف امیران سندھ کی آزاد ریاستیں حائل تھیں۔ نظر بر ایں روسیوں کی سیاسی پیشقدمی سے متاثر ہو کر کابل کے معاملات میں دخل دینا خواہ مخواہ اپنے آپ کو نئی دشواریوں

۱۔ مثلاً دیکھو آکسفرڈ ہسٹری صفحہ ۷۴۲ و ۷۴۳؛ مارشمین صفحہ ۳۸۰ وغیرہ۔

پھنسانا تھا۔[۵۱]

امیران سندھ کے ساتھ انگریزوں کے سیاسی تعلقات کا ذکر ہم آگے پڑھیں گے لیکن اس جگہ یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ۱۸۰۹ء (۱۲۲۴ھ) ہی میں جب بارک زئی قبیلے کے سرداروں نے احمد شاہ درانی کے جانشین پوتے شاہ شجاع کو کابل سے نکالا تو اس نے انگریزوں کی پناہ لی تھی کمپنی کی شمالی سرحد کی سب سے بڑی چھاونی اس وقت لودھیانہ میں تھی یہیں شاہ شجاع کو ٹھیرایا گیا اور وہ برابر اپنی میراث حاصل کرنے کے جوڑ توڑ کرتا رہتا تھا۔ اس نے دو مرتبہ سکھوں کی مدد اور انگریزوں کی تائید یا کم سے کم اجازت سے کابل پر فوج کشی بھی کی لیکن دونوں مرتبہ ناکام ہوا البتہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حکومت کابل کی اسی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا تھا اور دوست محمد خاں کے بھائی سلطان محمد کو ملا کر پشاور پر قبضہ کرلیا تھا۔ دوست محمد خاں بارک زئی قبیلے کا وہ سردار ہے جو شاہ شجاع کے اخراج کے بعد آخر میں (۱۲۴۱ھ ۱۸۲۶ء) افغانستان کا بادشاہ ہوگیا تھا۔ اس نے ایک دفعہ سکھوں سے پشاور چھین لیا تھا لیکن رنجیت سنگھ کی پوری قوت اور فوج کثیر کے سامنے سے دوبارہ ہٹنا پڑا اور اب وہ از سر نو سکھوں پر ایک مذہبی جہاد کی منادی اور تیاریاں کر رہا تھا اور سلطنت روس بھی وسط ایشیا کے مسلمانوں کی اس جہاد میں شرکت کرنے کی موید نظر آتی تھی![۵۲]

جنگ افغانستان

مذکورۂ بالا اسباب نے اگر انگلستان کے وزرا کو اندیشہ مند کر دیا تو ان کے خطرے بے بنیاد نہ تھے اور خود آوک لینڈ کا یہ منصوبہ کہ روسی خطرے کے انسداد کی بہترین صورت یہ ہے کہ افغانستان میں شاہ شجاع کو بادشاہ بنا دیا جائے، کچھ کم قابل حیرت یا "لائق ضحکہ" نہیں معلوم ہوتا۔ شاہ شجاع سے کمپنی کے پہلے ہی روابط قائم ہوگئے تھے اور دوست محمد یا کسی دوسرے افغان سردار سے انگریزوں کی وفاداری کی اتنی امید نہ ہوسکتی تھی جتنی شاہ شجاع سے تھی۔ چنانچہ دوست محمد خاں سے سیاسی

---

۵۱ مثلاً دیکھو اوکسٹوس صفحہ ۹۶، وغیرہ۔ انز کی "شارٹ ہسٹری آف دی برٹش انڈیا"، صفحہ ۲۴۳ و ۲۴۹۔

۵۲ انز صفحہ ۲۳۳؛ مارشمین (ملخص) صفحہ ۲۸۹ و ۳۰۰

تعلقات قائم کرنے کے لیئے جو انگریزی سفارت کابل بھیجی گئی تھی وہ بھی ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) میں ناکام واپس چلی آئی۔ دوست محمد خاں دوستی کے معاوضے میں چاہتا تھا کہ انگریز اپنے حلیف مہاراجہ رنجیت سنگھ سے پشاور اُسے واپس دلوادیں لیکن انگریزی سفیر صرف یہ قرار کر سکتا تھا کہ سکھ پشاور سے آگے نہ بڑھیں گے۔ حالانکہ یہ اقرار بالکل غیر ضروری اور منفعت [illegible] کے مصداق تھا کیونکہ سکھوں کو پشاور پر قبضہ رکھنا ہی وبال ہو گیا تھا۔ آگے بڑھنے کی ان میں ہمت نہ تھی۔[۵۱]

بہر حال آوک لینڈ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیئے افغانستان سے آمادۂ جنگ ہو گیا۔ بعض انگریز اہل الرائے اس کی تجویزوں سے اختلاف رکھتے تھے لیکن اس نے ان کی نصیحت نہ مانی اور شاہ شجاع اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ ایک "اتحادِ ثلاثہ" قائم کر کے دوست محمد خاں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ (اکتوبر ۱۸۳۸ء مطابق ۱۲۵۴ھ)

فیروز پور (پنجاب) کے جنگی مرکز سے ایک زبردست فوج درّہ بولان کے راستے افغانستان پر بھیجی گئی اور اس کی مدد کے لیئے ایک دوسری انگریزی فوج ملک سندھ کے راستے بڑھی کہ قندھار پر شمالی فوج سے جا ملے۔ قریب قریب اس بات کا تمام انگریزی تاریخوں میں اعتراف کیا گیا ہے کہ ملک سندھ سے انگریزی فوجوں کا لیجانا اس عہد و پیماں کی صریح خلاف ورزی تھی جو اسی زمانے میں بار بار امیرانِ سندھ کے ساتھ کیئے گئے تھے لیکن آوک لینڈ نے "ضرورتِ وقتی" کے لیئے اس کھلی ہوئی بدعہدی کو جائز قرار دیا اور بمبئی کی امدادی افواج نہ صرف سندھ سے گزریں بلکہ انھوں نے امیرانِ سندھ سے جبراً بہت سا روپیہ وصول کیا اور اُن سے زبردستی ایک نئے معاہدے پر دستخط لیئے جس نے ان امیروں کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا۔[۵۲]

---

۵۱ رنجیت سنگھ نے پشاور کی جنگی حفاظت اپنے ایک فرنگی سردار اوی تابیل کے سپرد کی تھی اور اس کا یہ قول محفوظ ہے کہ خیبر سے آگے بڑھنا درکنار سکھ سپاہیوں کو صرف خیبر کے نام سے ہول ہوجاتا تھا (مارشن میں صفحہ ۲۹)

۵۲ ونسنٹ اسمتھ نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بجنسہ ترجمہ کر دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

"بمبئی کی امدادی فوج کی پیشقدمی میں ۱۸۳۲ء کے معاہدوں کی صریح خلاف ورزی مضمر تھی۔ مگر لارڈ آوک لینڈ نے

اواخر اپریل ۱۸۳۹ء (۱۲۵۵ھ) میں انگریزی فوجیں شاہ شجاع کو لئے ہوئے قندھار پہنچ گئیں۔ پہاڑی راستے اور سردی کے موسم سے سفر میں ہر قسم کے مصائب و نقصانات اٹھانے پڑے۔ لیکن دشمن سے کوئی مقابلہ نہیں ہوا۔ معمولی مزاحمت کے بعد قلعۂ غزنی بھی قبضے میں آگیا۔ دوست محمد خاں نے یہ خبر سن کر کابل کو خالی کر دیا اور ماہ اگست ۱۸۳۹ء (۱۲۵۵ھ) میں شاہ شجاع اور اس کے انگریز حامی بلا دقت پہنچ کر تخت کابل پر قابض ہو گئے۔

شاہ شجاع کو افغانستان میں پہنچانے اور دوبارہ بادشاہ بنا دینے کے بعد معاہدات اور نیز مصلحت کا مقتضیٰ یہ تھا کہ انگریزی فوجوں کو واپس بلا لیا جائے لیکن اول تو شاہ شجاع کے طاقتور حریفوں کے اندیشے سے اور پھر ایران و روس کی رقابت کے جوش نے واپسی کو ملتوی کر دیا گیا اور جس قدر زیادہ دیر تک انگریز افغانستان میں ٹھہرے اسی قدر زیادہ وہاں کے مقامی جھگڑوں میں الجھ گئے۔ اور اتنے عرصے میں افغانوں کو عام طور پر یقین ہو گیا کہ شاہ شجاع کی امداد محض حیلہ ہے بلکہ خود انگریز ملک افغانستان پر تسلط کرنا چاہتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۲۴) اپنے سکرٹری (میک ناٹن) کی معرفت کابل و دہلی سے حیدرآباد (سندھ) کے ریزیڈنٹ کو حکم دیا کہ "تم سندھ کے امیروں کو اطلاع دے دو کہ جب تک ہماری موجودہ ضرورتیں باقی رہیں گی، اس وقت تک معاہدے کی وہ دفعہ جس میں دریائے سندھ کی راہ جنگی ساز و سامان بھیجنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ لازمی طور پر معطل رکھی جائیں گی تا آنکہ وہ مہم سر ہو جائے جو خود اسی معاہدے کے کرنے والوں کی دوامی حفاظت کے لئے۔ اسلئے (کابل) روانہ کی گئی ہے"

"اسی طرح واثق عہد و پیمان کے خلاف شکارپور، بھکر اور سندھ کے کئی اور مقامات پر انگریزی فوج نے قبضہ بھی کر لیا خود امیروں پر انگریزوں سے عداوت اور عہد شکنی کے الزامات وارد کئے گئے جو محض لا یعنی تھے۔ پھر ان سے فروری ۱۸۳۹ء میں ایک نام نہاد معاہدے پر جبراً دستخط لے لئے گئے جس نے ان کی آزادی کو فنا کر دیا انہیں ایک امدادی فوج رکھنے اور اس کے لئے تین لاکھ روپیہ سالانہ دینے اور اپنے ہاں کمپنی کا سکہ چلانے پر مجبور کیا گیا اور طرح طرح سے ان سے روپیہ وصول کیا گیا اور بہت سی زیادتیاں ہوئیں مگر اس ناخوشگوار مضمون کو مزید طول دینا بیکار ہوگا۔ (اوکس ہسٹری صفحہ ۱۷۸)

یہاں اتنی صراحت اور کر دینی چاہئے کہ انگریزوں کی شمالی فوج کا سیدھا راستہ بھی پنجاب سے گزرتا تھا لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اسے گوارا نہ کیا اور اس پر زور نہ چل سکتا تھا کہ سندھ کی طرح پنجاب کے مقامات پر بھی "ہنگامی ضرورتیا" کی خاطر قبضہ کر لیا جاتا۔

بعض انگریز عہدہ داروں کی بدچلنی[51] سے بھی اہل کابل کو سخت اشتعال پیدا ہوا اور دوسرے سال بھر کے بعد انگریزوں نے افغانی قبائل کو وہ روپیہ دینا موقوف کر دیا جسے یہ قبائل اپنی غیر جانب داری کا واجبی معاوضہ سمجھتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۴۱ء (اواخر سنہ ۱۲۵۶ھ) میں جابجا انگریزوں کے خلاف شورشیں بپا ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ اس شورش نے ایک ایسی قومی جنگ کی صورت اختیار کر لی جس سے ممالک ایشیا میں اہل یورپ کو غالباً پہلے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا نظمائے کمپنی کو ولایت میں ان حالات کی اطلاع ہوئی تو وہ پریشان ہو گئے اور انھوں نے گورنر جنرل کو مشورہ دیا کہ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی ناکامیابی کو تسلیم کر لیں اور افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ کر واپس چلے آئیں، لارڈ آکلینڈ[52] نے ان کی صلاح نہ مانی اور اس کے کابل میں ٹھیرے رہنے کے ارادے کو غالباً سب سے زیادہ تقویت اس بات سے پہنچی کہ امیر دوست محمد خاں نے کچھ عرصے تک ادھر ادھر چھپے رہنے اور چند لڑائیاں لڑنے کے بعد اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا (نومبر سنہ ۱۸۴۰ء) انگریزوں نے اس کے ساتھ بہت عزت کا سلوک کیا اور کلکتہ بھیج کر دو لاکھ روپیہ سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کیا لیکن دوست محمد خاں کی مصالحت یا اطاعت سے افغانوں کی عداوت میں کوئی کمی نہ آئی اور ہر طرف انگریزوں کے خلاف شورش و جنگ کا بازار گرم ہو گیا۔ انگریزی فوجوں نے اس مخالفت کو جتنا بزور شمشیر فرو کرنا چاہا اسی قدر اہل افغانستان کی ناراضی بڑھتی گئی اور بچہ بچہ انگریزوں کا دشمن ہو گیا۔ انگریزی فوج کی کل تعداد جو اس وقت افغانستان میں مقیم تھی پچیس ہزار کے قریب بتائی گئی ہے[53]۔ اس کا سب سے بڑا حصہ یعنی پایۂ تخت کابل میں فروکش تھا اور آٹھ دس ہزار سپاہی غزنی، جلال آباد، قندھار وغیرہ مرکزی قلعوں میں متعین کر دیے گئے تھے۔ ابتدا میں سب سے زیادہ تکلیف اور پریشانی انھی بیرونی فوجوں کو پیش آئی اور اپنے قلعوں میں ان کی حالت محصورین کی سی ہو گئی۔ لیکن رفتہ رفتہ دشمن کی سب سے بڑی تعداد نے کابل کو گھیر لیا اور اسی شہر کے قریب ایک بڑے معرکے میں انگریزی

[51] اوکسن ہیس صفحہ ۶۰۰۔ مارشمین صفحہ ۳۰۲ ۔

[52] اوکسن ہیس صفحہ ۶۰۰

[53] مارشمین صفحہ ۳۰۶

فوج کو سخت شکست ہوئی اور وہ بہ مشکل بھاگ کر اپنے مورچوں تک سلامت پہنچ سکی [۵۱] (نومبر ۱۸۴۱ء مطابق ۱۲۵۷ھ)

اس واقعے نے افغانوں کے حوصلے بڑھا دیئے اور انگریزی فوج کے سپاہیوں کی ہمت کو اور بھی پست کر دیا۔ انھیں چھاونی سے نکل کر شہر تک جانا دشوار ہو گیا اور خود اہل شہر کی عداوت نے انگریزی لشکرگاہ میں اجناس خوردنی کا قحط ڈال دیا۔ اس وقت دشمن کے کیمپ میں دوست محمد خاں کے فرزند محمد اکبر خاں کے آجانے سے انگریزوں کو ایک حد تک ڈھارس ہوئی کیونکہ یہ نوجوان سردار مصالحت پر آمادہ تھا اور اکثر افغانی قبائل کے لوگ بھی اس کے مطیع اور فرماں بردار تھے۔ الغرض انگریز سپہ سالاروں کو صلح کر لینا ہی بہت غنیمت معلوم ہوا جس کی شرطیں یہ تھیں کہ جلال آباد، کابل، قندھار و غزنی کو انگریزی فوجیں فوراً خالی کر دیں گی۔ دوست محمد خاں اور اس کے خاندان کو واپس کابل بھیج دیا جائے گا اور شاہ شجاع بادشاہی کے دعوی سے دست بردار ہو جائے گا مگر اسے اس کی اجازت ہوگی کہ خواہ انگریزوں کے ساتھ ہندوستان چلا جائے خواہ وظیفہ لے کر کابل میں رہے [۵۲]۔

لیکن ادھر تو قابو یافتہ افغان بعض نئے مطالبات پیش کر رہے تھے کہ انھیں غزنی اور جلال آباد وغیرہ کے تخلیئے کا اطمینان ہو جائے اور ادھر انگریز سفیر میک ناٹن بعض افغانی قبائل سے در پردہ سلسلہ جنبانی کر رہا تھا کہ اگر وہ شاہ شجاع کی رفاقت پر آمادہ ہوں تو مذکورۂ بالا صلح کو منسوخ کر دیا جائے [۵۳] لیکن اس کوشش میں کوئی کامیابی کی صورت پیدا نہ ہوئی تھی کہ محمد اکبر خاں نے ملاقات کے حیلے سے میک ناٹن کو بلا کر قتل کر دیا اور انگریز سرداروں کو افغانوں کے تازہ مطالبات بھی طوعاً و کرہاً تسلیم کرنے پڑے یعنی چند زیر عمال اور چھ توپوں کے سوا، پورا توپ خانہ، تمام بندوقیں اور گولہ بارود افغانوں کے حوالے کر کے وہ جنوری ۱۸۴۲ء (۱۲۵۷ھ) میں کابل سے پشاور روانہ ہو گئے، اس وقت انگریزی فوج کی تعداد پانچ ہزار سے بھی کم رہ گئی تھی اور اسی کے ساتھ

---

[۵۱] مارشمن میں صفحہ ۴۱۱

[۵۲] مارشمن میں۔ ۴۱۲

[۵۳] مارشمن میں۔ ۴۱۴

اکبار بارہ ہزار بہیر کے آدمی تھے۔ اپنے تمام مطالبات تسلیم کرا لینے کے بعد بظاہر اکبر خاں اور اس کے بارک زئی سرداروں کی شکستہ دل انگریزی فوج کی واپسی میں کوئی خاص رکاوٹ ڈالنی نہ چاہتے تھے لیکن انگریزوں نے سارے ملک کو اپنا دشمن بنا لیا تھا اور ان میں سب سے زیادہ خونخوار غلزئی قبائل کے لوگ تھے جن کے ساتھ انگریزوں نے ابتدا میں کسی قدر بدسلوکی کی تھی۔ ان بے رحم و بے وفا قبائل کو انتقام کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا۔ انھوں نے کابل سے تھوڑے ہی فاصلے پر خورد کابل کے تنگ درّے میں انگریزی فوج پر حملہ کیا جس میں ہزاروں سپاہی اور ساتھ کے آدمی مارے گئے مختصر یہ کہ چند ہی منزل کے سفر میں انگریزی سپاہ کو برف باری۔ فاقہ کشی اور ان پیہم حملوں نے بالکل تباہ کر دیا اور ان عورتوں بچوں یا انگریز سرداروں کے سوا، جو بطور یرغمال اکبر خاں کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ ساری فوج ہلاک ہو گئی فقط ایک شخص ڈاکٹر برائیڈن زندہ بچ کر جلال آباد پہنچ سکا جس نے اس خوفناک تباہی کی اطلاع دی[1]۔

تلافی کی تدابیر

مذکورۂ بالا نقصانات کی خبروں نے ہندوستان اور انگلستان میں تہلکہ سا ڈال دیا۔ بے شبہ کابل میں شکست اور اس آخری مصیبت کا ایک بڑا سبب وہاں کے انگریز سپہ سالاروں کی نااہلی اور باہمی نااتفاقی تھی لیکن اکثر انگریز اہل الرائے اس تمام خرابی کا ذمہ دار لارڈ آکلینڈ کو قرار دیتے تھے جس نے فتح کابل کا "مجنونانہ منصوبہ" سوچا تھا۔ چنانچہ اس کو فوراً واپس بلا لیا گیا اور فروری ۱۸۴۲ء میں لارڈ ایلن برو اس کی جگہ ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا جس نے سب سے پہلے کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے گزشتہ ہزیمت کی تلافی کی جائے۔

واضح رہے کہ کابل میں انگریزی فوج کی شکست اور مذکورۂ بالا شرائط صلح قبول کر لینے کے باوجود، جلال آباد و غزنی وغیرہ مقامات کی انگریزی فوجوں نے اپنے قلعے خالی نہیں کیے تھے۔ چند روز بعد غزنی کے انگریز سپہ سالار کو ہتھیار رکھ دینے پڑے۔ لیکن جلال آباد، قندھار اور قلات غلزئی کی متعینہ افواج برابر مدافعت کرتی رہیں اور ایلن برو نے سب سے پہلے انھی کو کمک بھیجکر دشمن کے محاصرے سے نجات دلائی۔

---

[1] مارشمین صفحہ ۷۰۳

یہ گورنر جنرل امدادی فوج کی مزید پیشقدمی سے اندیشہ مند تھا لیکن اس تازہ دم لشکر کو جو کافی ساز و سامان کے ساتھ ہندوستان سے بھیجا گیا پولک اور ناٹ جیسے پرجوش سپہ سالار ملے تھے۔ وہ اپنی ذمہ داری پر غزنی اور کابل تک بڑھے اور اہل افغانستان کی دشمنی کی سزا میں شہر غزنی کو جلا کر مسمار کرا دیا۔ افغانوں کی طرف سے ان کی کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی اور کابل تک پہنچ کر انگریزی فوجیں اس "بھڑوں کے چھتے" کی حدود سے واپس پشاور چلی آئیں (نومبر ۱۸۴۲ء[سلہ])۔ کمپنی کی طرف سے لارڈ الن برو نے گزشتہ غلطی (یعنی افغانستان پر فوج کشی) کا اعتراف کیا اور دوست محمد خاں کو دوبارہ اپنے ملک میں جانے کی اجازت دی، جہاں وہ اپنی طویل زندگی کے باقی ایام میں بلا خرخشہ حکومت کرتا رہا۔

الحاق سندھ

اگرچہ لارڈ الن برو متعدد تحریروں میں اپنی صلح پسندی کا گویا بانگ دہل اعلان کرتا رہا تھا اور اسی زمانے میں ایک "تمغائے امن و صلح" بھی اس نے ضرب کرایا تھا[سلہ] لیکن ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے ملک سندھ پر قبضہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ چنانچہ "لارڈ اوکلینڈ نے تو صرف دیدہ دلیری سے امیران سندھ کے ساتھ بدعہدی کی تھی۔ الن برو نے اس سے بھی بڑھ کر یہ کام کیا کہ عمداً انہیں جنگ کا اشتعال دلایا کہ اس ملک کا الحاق کیا جا سکے۔۔۔"[سلہ]

سندھ کے یہ "امیر" یا "میر" تالپور خاندان کے بلوچی سردار تھے اور ان کی تین شاخیں ہو گئی تھیں۔ ایک شاخ یا خاندان شمالی سندھ میں حکومت کرتا تھا، اور اس کا صدر مقام خیرپور تھا۔ شکارپور، بھکر وغیرہ بارونق تجارتی شہر اس کے علاقے میں تھے۔ دوسرا خاندان سندھ کے مشرقی اضلاع کا، اور تیسرا سندھ کے وسطی اور جنوبی علاقوں کا حاکم

سلہ اس واپسی کے متعلق مارشمین لکھتا ہے کہ "اہم کا مقصد پورا ہو گیا یعنی افغانستان کو ہم نے دوبارہ فتح کر لیا۔ اپنے قیدی چھڑا لیے اور ہماری جنگی شہرت میں پھر وہی آب و تاب آ گئی۔ بایں ہمہ (واپس ہوتے وقت) پائے تخت کابل میں اپنے انتقام کی یادگار چھوڑنی ضرور تھی۔ لہٰذا وہاں کے بڑے مسقف بازار کو جس میں انگریزی سفیر (سر ولیم میک ناٹن) کی نعش کی تشہیر کی گئی تھی اور جو وسط ایشیا میں اپنی قسم کی سب سے شاندار عمارت تھا سرنگ لگا کے اڑا دیا" (صفحہ ۴۲۹)

سلہ مارشمین صفحہ ۴۳۱۔

سلہ اوکسفرڈ ہسٹری " ۶۴۴۔

تھا۔ اس تیسری شاخ کا پایۂ تخت حیدر آباد (سندھ) اور جنگی قوت واقتدار سب سے زیادہ تھا لیکن آپس میں ان امیرانِ سندھ کے درمیان کیسے ہی اختلاف کیوں نہ ہوں، بیرونی حریف کے مقابلے میں وہ ایک ہو جاتے تھے اور کم سے کم اس بارے میں سندھ کے تمام اہل الرائے متفق تھے کہ جہاں تک ہو سکے سندھ میں انگریزوں کو کسی قسم کی مداخلت کا موقع نہ دیا جائے یہاں تک کہ وہ کمپنی کے ساتھ کوئی تجارتی تعلق بھی رکھنا نہ چاہتے تھے اور جب تجارتی معاہدات کرنے پر بہت مجبور کیا گیا تو اس وقت بھی انھوں نے ہر عہدنامے میں خاص طور پر صراحت کے ساتھ یہ شرط لکھوائی کہ فریقین ایک دوسرے کے ملکی مقبوضات پر "لالچ کی نظر تک نہ ڈالیں گے"[۵۱] بایں ہمہ جنگ افغانستان کے موقع پر سندھ کے بعض مقامات پر جس طرح زبردستی قبضہ کیا گیا اور خراج گزاری کے اقرار لئے گئے ان کا اجمالاً ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اب الن برو نے سر چارلس نیپئیر کو کمپنی کا نمائندہ بنا کر سندھ روانہ کیا جو اس ملک کا الحاق کرنے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ اس نے اہل سندھ کو اس قدر دق کیا کہ بمصداق تنگ آمد بجنگ آمد بلوچیوں نے بگڑ کر کرنل اوٹرم کی قیام گاہ پر حملہ کیا۔ اس مقصد سے نیپئیر کو حسب دلخواہ حیلہ مل گیا اور اس نے باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا[۵۲] (فروری ۱۸۴۳ء مطابق ۱۲۵۹ھ)

کمپنی کی قواعدداں افواج اور توپ و تفنگ کا مقابلہ کرنے کی امیرانِ سندھ میں قوت نہ تھی دو ہی لڑائیوں میں ان کا شیرازہ بکھر گیا اور پھر چند روز کی کشمکش میں وہ قبول اطاعت پر مجبور ہو گئے مگر نیپئیر نے ان "امیروں" کو جلاوطن کر کے سندھ کے الحاق کا اعلان کر دیا اور سوائے ریاست خیرپور کے، جہاں کا رئیس لڑائی میں انگریزوں کا معاون رہا تھا، یہ تمام علاقہ براہ راست کمپنی کے زیرنگیں آگیا۔

الن برو کی بازبینی: الن برو کے مختصر عہد حکومت کے دو واقعے اور قابل ذکر ہیں۔ اول تو یہ کہ اس نے دو لڑائیوں یعنی جنگ مہاراج پور و پنیار میں ریاست گوالیار کی جنگی قوت توڑ دی جو وہاں کی بیوہ رانی تارا بائی اور اس کے متبنیٰ بیٹے کے صغر سن اور گوالیار کے سرداروں کی نااتفاقی

۵۱ اوکسں ہسں صفحہ ۶۶۱

۵۲ اوکسں ہسں صفحہ ۶۸۵

سے بہت اندیشہ ناک نظر آنے لگی تھی [1] دوسرے اسی سال (۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۴۳ء) الن برو نے بردہ فروشی کو خلاف قانون قرار دیا اور اعلان کر دیا کہ آیندہ کوئی شخص کمپنی کے علاقے میں "غلام" نہیں بنایا جا سکے گا۔ اسی زمانے میں بنگال و مدراس کی ہندوستانی افواج میں شورش ہوئی اور نظمائے کمپنی نے جو الن برو کی نمائش پسندی اور خودداری سے پہلے ہی سخت شاکی تھے، اُسے واپس بلا لیا (جولائی ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء)

۲۔ جنگ ہائے پنجاب اور نئے مقبوضات

لارڈ ہارڈنگ (اوّل) — الن برو کا جانشین۔ سر ہنری ہارڈنگ جسے بعد میں "لارڈ" کا خطاب حاصل ہوا، انگلستان کے نامی گرامی شرفا میں ہے۔ یورپ کی کئی لڑائیوں میں اس نے سپہ گری کے جوہر دکھائے اور زخم کھائے تھے۔ سالہا سال تک وہ پارلیمنٹ کا رکن اور ایک مرتبہ وزارت جنگ کے معزز عہدے پر ممتاز رہ چکا تھا اور اگرچہ ہندوستان آنے کے وقت اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی لیکن سپاہیانہ جوش اور جفاکشی میں زیادہ فرق نہ آیا تھا اور اس کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی کمپنی کے اندرونی انتظامات میں تازہ قوت پیدا ہو گئی۔ لارڈ ہارڈنگ کے اوائل عہد میں دختر کشی اور انسانی قربانی یا بھینٹ کی قبیح رسموں کا جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں جاری تھیں سختی سے انسداد کیا گیا۔ ریلوں کے اجرا اور نہر کاوی کے نقشے تیار ہوئے لیکن اس گورنر جنرل کا اصلی اور مشہور کارنامہ "پہلی جنگ پنجاب" ہے جس میں سکھوں کی قوت ٹوٹی اور ملک پنجاب میں انگریزوں کا اثر قائم ہو گیا۔

جنگ پنجاب — عام انگریزی روایات کے بموجب اس جنگ کی ابتدا سکھوں کی طرف سے ہوئی جن کی فوج مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات (۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء) کے بعد حکومت کے قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ خود حکومت (پنجاب) کی کمزوری اور ابتری اسی واقعے سے ظاہر ہے کہ گذشتہ چھ برس کے اندر چار شخص گدّی پر بیٹھے اور چاروں خونیوں کے ہاتھ سے مارے گئے اور اب یعنی جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں (۱۲۶۱ھ) جو پانچواں حاکم "شیر پنجاب" کا جانشین ہوا اول تو اس کا نسب ہی درست نہ تھا دوسرے اس کی عمر پانچ سات سال سے زیادہ نہ تھی اور اس کی طرف سے رانی جنداں اتالیق کی حیثیت سے حکومت کرتی تھی۔

[1] مذکورہ بالا لڑائیوں میں فتح حاصل کرنے کے بعد رانی کو وظیفہ دے کر معاملات ملکی سے بالکل بے دخل کر دیا گیا۔ راجہ کی نابالغی تک تمام اختیارات انگریز ریذیڈنٹ کے تفویض ہوئے اور ریاست کی فوج گھٹا کر وہاں انگریزی کمپنی کی پلٹنوں کی تعداد بڑھا دی گئی۔

یہ رانی بھی کوئی خاص لیاقت یا خاندانی وجاہت نہ رکھتی تھی اور ظاہر تھا کہ سکھوں کی شل شورہ پشت سپاہیوں پر اس کا کوئی حقیقی رعب داب نہ ہو سکتا تھا بلکہ درحقیقت یہ ان سپاہیوں کی عنایت تھی کہ انھوں نے جنداں کے صغیر سن بچے دلیپ سنگھ کو رنجیت سنگھ کا بیٹا اور پنجاب کا حاکم تسلیم کر لیا۔[1]

ان سکھ سپاہیوں کی تعداد جنھیں رنجیت سنگھ کی غیر معمولی قابلیت اور سالہا سال کی کوشش نے ایک زبردست فوج کی شکل میں مرتب کر لیا تھا، نوّے ہزار کے قریب بتائی گئی ہے اور اس میں پچاس ہزار سے زیادہ پیادہ فوج کے وہ سپاہی تھے جو جدید ترین اسلحہ سے مسلح اور مغربی قواعدِ جنگ سے بخوبی واقف تھے اور اُن کے فرنگی سرداروں میں کم سے کم دو ایسے تھے جو خاص نپولین بونا پارٹ کی فوجی ملازمت اور تربیت میں رہ چکے تھے۔ اسی طرح سکھوں کے پاس بڑا زبردست توپخانہ تھا اور مجموعی طور پر اُنکی فوجی قوت ایسی اچھی تھی کہ انگریز اُن پر حملہ کرنے میں ہچکچاتے تھے۔[2] چنانچہ اس جنگ کی پہلی تین لڑائیاں ستلج کے جنوب (یعنی انگریزی علاقے) میں ہوئیں۔ (دسمبر ۱۸۴۵ء تا جنوری ۱۸۴۶ء مطابق سنہ ۱۲۶۱ھ)

آغاز جنگ کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ سکھوں نے دہلی کی تسخیر و تاراجی کے ارادے سے ستلج کو عبور کیا۔ رانی جنداں اور اس کے مشیروں نے بھی ان سرکش سپاہیوں کے دباؤ سے بچنے کے لئے انھیں انگریزی علاقے پر حملے کی تحریک کی یعنی ان کی تخریب و تباہی کا سامان کیا اور ان جنگ جو سپاہیوں نے جن کا کوئی والی وارث سر دھرا نہ تھا، اس تجویز کو قبول کر لیا۔ پھر ستلج اتر کے لدھیانہ کے مغرب میں ان کے انگریزی فوج کے ساتھ دو یا تین خونریز معرکے ہوئے (مدکی، فیروز شاہ، علی وال کی لڑائیاں) جن میں ابتدائی کامیابی کے بعد آخر میں سکھوں کو شکست ہوئی اور وہ بہت نقصان اٹھا کر پسپا ہو گئے۔

لیکن جنگ کا آخری معرکہ ستلج و بیاس کے سنگم کے قریب سبراؤں پر ہوا۔ (فروری سنہ ۱۸۴۶ء) جس میں سکھوں کو سخت ہزیمت نصیب ہوئی اور نتیجہ ان مصائب اور

---

[1] دلیپ سنگھ کے نسب اور جنداں رانی کے متعلق دیکھو گریفن کی کتاب "رنجیت سنگھ" صفحہ ۱۰۹-۱۱۰۔ اکس ہی صفحہ ۶۹۳

[2] اکس ہی صفحہ ۶۹۲

کچھ باہمی نفاق کی وجہ سے بھی وہ انگریزی فوج کو نہ روک سکے جس نے چند روز میں آگے بڑھکر لاہور پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا۔ اسی جگہ یہ شرائط صلح قرار پائیں کہ دوآبہ جالندھر اور تاوان جنگ کے ساتھ کشمیر و ہزارہ انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور لاہور میں ایک انگریز رزیڈنٹ۔ اور ختم سال تک انگریزی فوج بھی مقیم رہے گی۔

لاہور کے قبضے اور ان شرائط کے طے کرنے میں بڑی آسانی اس لیئے ہوئی کہ خود دربار لاہور کے بعض سکھ سردار انگریزوں کے رفیق و مددگار ہو گئے حتیٰ کہ انھی کی درخواست پر چند ماہ بعد مذکورہ بالا معاہدے میں یہ ترمیم کر دی گئی کہ انگریزی فوج ایک سال کی بجائے آٹھ سال تک لاہور میں مقیم یا قابض رہے گی۔ نیز انگریز ریزیڈنٹ (سر ہنری لارنس) اس انتظامی مجلس کا صدر نشین بنا دیا گیا جو دلیپ سنگھ کی نابالغی کے زمانے میں حکومت کرنے کے واسطے مقرر ہوئی تھی اور لارنس کی یہ صدارت کچھ فوجی اقتدار و قوت اور کچھ ذاتی قابلیت کی بدولت ایسی حکومت بن گئی کہ راجہ اور اس کے سکھ سرداروں کا فقط نام ہی نام رہ گیا ورنہ قریب قریب سارے اختیارات انگریز ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں آ گئے۔[1]

دوسری جنگ کے اسباب

انگریزوں کا یہ تسلط یقیناً پنجاب کے بہت سے سکھوں کو ناگوار ہوا ہوگا جن کی تعداد اگرچہ گھٹا دی گئی تھی پھر بھی شمالی اور مغربی اضلاع میں متعدد جنگجو سکھ ہر طرح کے سامان کے ساتھ موجود تھے۔ بایں ہمہ ان کی ناراضی کئی سال تک دبی ہوئی آگ کی طرح اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ بظاہر ہر طرف امن و امان ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب تک لارڈ ہارڈنگ اپنی میعاد پوری کر کے انگلستان گیا (۱۸۴۸ء مطابق ۱۲۶۳ھ) اس وقت تک جنگ و جدال کے کچھ آثار نہ تھے اور ہارڈنگ نے اپنے جانشین (ڈلہاؤزی) کو یقین دلایا تھا کہ آئندہ سات برس تک ہندوستان میں توپ چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

لیکن اول تو نیا گورنر جنرل کشورستانی کا بڑا حامی تھا دوسرے ملتان کے سکھ صوبہ دار کی لاہور کے ریزیڈنٹ سے مخالفت اور ابتدائی کامیابی نے بہت سے سکھ سرداروں کو انگریزوں کے خلاف آمادۂ جنگ کر دیا۔ یہ سکھ صوبہ دار مول راج نامی چند سال پہلے اپنے باپ کی جگہ ملتان کا حاکم ہوا تھا۔ اس کے متوفی باپ کی زرستانی

---

[1] ادکس ہسن صفحہ ۶۹۵

اور دولتمندی سارے پنجاب میں مشہور تھی اور اسی بنا پر لاہور کی حکومت نے مولراج سے سند صوبہ داری کے معاوضے میں ایک کروڑ روپیہ نذرانے کا مطالبہ کیا۔ مول راج نے اس قدر کثیر روپیہ دینے سے انکار کیا اور آخر میں رانی جنداں اور اس کے مشیر اس رقم کا صرف پانچواں حصہ (بیس لاکھ روپے) لینے پر رضامند ہو گئے تھے کہ اتنے میں انگریزوں سے لڑائی چھڑ گئی اور دربار میں انگریزی ریذیڈنٹ کا عمل دخل ہو گیا لیکن جب انگریز ریذیڈنٹ نے از سر نو اس معاملے کو اٹھایا اور اندرونی انتظامات میں بھی مولراج کو بعض نئی قیود و ہدایات کا پابند بنانا چاہا تو اس سے تنگ آکر استعفا دینے کی دھمکی دی۔ ریذیڈنٹ فوراً استعفا قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا بلکہ مولراج کی بجائے اس نے اپنے ایک معتمد علیہ کھان سنگھ کو ملتان کی صوبہ داری پر نامزد کر دیا اور نئے صوبہ دار کے ساتھ دو انگریز ملتان بھیجے گئے کہ کھان سنگھ ان کے مشورے سے صوبے کا انتظام کرے[1] (مارچ ۱۸۴۸ء)

ان انگریز مشیروں نے جائزہ لیتے وقت حساب فہمی میں مولراج سے بہت سختی کا برتاؤ کیا اور اگرچہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ خود مولراج نے ان انگریزوں کو قتل کرنے کی تحریک کی لیکن جب ان انگریزوں کے ساتھ کے سکھ سپاہیوں نے بگڑ کر اپنے انگریز افسروں کو مار ڈالا تو مولراج نے قاتلوں کے اس فعل پر پسندیدگی ظاہر کی اور علانیہ انگریزوں کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ اس کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بنوں اور لاہور سے جو انگریزی فوجیں آئی تھیں وہ خاطر خواہ کامیابی نہ حاصل کر سکیں اور ان فوجوں کے بہت سے سکھ سپاہی اور سردار مولراج سے مل گئے۔

چلیان والہ اور گجرات کے معرکے

اس بات کے بھی ثبوت پائے گئے کہ بہت سے سکھ سردار در پردہ انگریزی حکومت کے خلاف سازباز کر رہے ہیں اور انھوں نے پشاور دے کر امیر دوست محمد خاں کو اپنا شریک و مددگار بنا لیا ہے۔ غرض ملتان کے معمولی فساد نے چند ہی مہینے میں بڑھتے بڑھتے ایک بڑی جنگ کی صورت اختیار کر لی اور ڈلہوزی نے بڑے طیش و غضب

[1] مارشمین صفحہ ۴۵۸۔ ونسنٹ اسمتھ نے کھان سنگھ کا نام ہی اڑا دیا ہے (صفحہ ۶۵۸) اور دیگر روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کھان سنگھ محض برائے نام صوبہ دار تھا اور اصلی اختیارات ان ہی دو انگریزوں میں سے ایک نوجوان عہدہ دار مسٹر اگنیو کے ہاتھ میں مرتکز تصور تھے۔

سے ساتھ وسیع پیمانے پر سکھوں کا قلع قمع کرنے کی تیاریاں کیں! نومبر ۱۸۴۸ء (۱۲۶۴ھ) میں ایک بہت بڑی انگریزی فوج فیروزپور میں جمع ہوئی اور خود انگریزی سپہ سالار (لارڈ گف) اسے لیکر لاہور کے شمال میں بڑھا جہاں سکھ فوجیں سردار چتر سنگھ حاکم ہزارہ اور اس کے بہادر فرزند سردار شیر سنگھ کی ماتحتی میں اپنی قومی حکومت و آزادی کے واسطے آخری جدوجہد کرنے جمع ہوئی تھیں۔ ابتدائی آویزشوں کے بعد جنگ کا اصلی معرکہ جہلم کے کنارے چلیانوالہ کے میدانوں میں ہوا جو لاہور سے تقریباً سو میل شمال مغرب میں واقع ہے (جنوری ۱۸۴۹ء مطابق ۱۲۶۴ھ) سکھ سپاہیوں کی بہادری اور جنگ جوئی ہمیشہ سے مسلّم ہے لیکن اس موقع پر اُن کو بہت اچھے سپہ سالار ملے اور ایک اعتبار سے لڑائی میں انھی کو کامیابی ہوئی کہ انگریزی فوجوں کو میدان سے ہٹ کر قصبۂ چلیانوالہ تک واپس آنا پڑا[1] مگر اس کے تھوڑے ہی دن بعد ملتان تسخیر ہو گیا اور وہ انگریزی فوجیں جو اس شہر کے محاصرے میں مصروف تھیں۔ گف کی امداد کے لئے پنجاب پہنچ گئیں۔ ادھر شیر سنگھ کو رسد رسانی کی مشکلات نے اپنے مضبوط مورچے چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ لاہور کی سمت میں بڑھ رہا تھا کہ چناب

---

[1] اس لڑائی میں فریقین کا بہت نقصان ہوا اور دونوں اپنی فتح کے دعویدار تھے مگر عام طور پر معترف ہے کہ جنگ کا نتیجہ انگریزوں کے حق میں قریب قریب شکست ہی ہوا۔ چار انگریزی توپیں اور تین انگریزی پلٹنوں کے جھنڈے غنیم نے چھین لئے انگریزی (گوروں کے) رسالے کی شہرت پر (جسے قلیل التعداد سکھ رسالوں نے بہت بری طرح بھگا دیا تھا) سخت حرف آیا اور اسی مناسبت سے سکھوں کی جوانمردی کا شہرہ زیادہ ہو گیا۔ انگریزی فوج کے مقتولین و مجروحین کا شمار ۲۴۴۶ تھا اور اس میں نو اسی افسر شامل تھے! اگرچہ گورنر جنرل (ڈلہوزی) نے سرکاری طور پر اس لڑائی کو اپنی فتح بتایا اور انگریزی قلعوں سے اس کی خوشی میں سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں لیکن شیر سنگھ اس سے پیشتر میدان جنگ ہی میں شام کے وقت اپنی فتح کی سلامی سر کر چکا تھا۔ اور ہندوستان میں بھی عام طور پر اس لڑائی کو انگریزوں کی سخت اور افسوسناک ہزیمت سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح انگلستان میں جب جنگ کی تفصیل پہنچی تو توپوں اور جھنڈوں کا چھن جانا، برطانوی رسالے کا دشمن کے سامنے سے فرار ہونا اور ایک پوری برطانوی رجمنٹ کا ہلاک ہونا ایسے واقعات تھے کہ انہیں سنکر وہاں لوگوں میں سراسیمگی اور ناراضی پیدا ہو گئی۔ ان تمام مصائب کی اصلی وجہ عام طور پر لارڈ گف کی بری تدابیر جنگ کو قرار دیا گیا اور ڈیوک اوف ولنگٹن کے اتفاق رائے سے گف کو عہدۂ سپہ سالاری سے

عبور کرنے سے پہلے قصبۂ گجرات کے قریب انگریزی فوجوں نے آ لیا اور چند ہی گھنٹے کی گولہ باری میں سکھوں کی ترتیب درہم برہم کر دی اور دن ڈھلتے ڈھلتے پنجاب کی آزادی کے یہ آخری حامی اپنی سب توپیں اور جنگی ساز و سامان چھوڑ کر میدان سے فرار ہو گئے (فروری ۱۸۴۹ء ۱۲۶۵ھ) دریائے سندھ کے پار تک ایک انگریزی فوج نے شکست خوردہ سکھوں کا اور ان کے بعض افغانی مددگاروں کا تعاقب نہ چھوڑا اور چند ہی ہفتے میں اہل پنجاب کی زبردست جنگی قوت بالکل فنا ہو گئی ہے۔

الحاق پنجاب

اس کامیابی کے بعد ڈلہوزی نے نظمائے کمپنی یا اپنی کونسل کی رائے لیئے بغیر بلا پس و پیش ملک **پنجاب** کے الحاق کا اعلان کر دیا (۱۸۴۹ء) اور نابالغ دلیپ سنگھ کو سالانہ وظیفے پر علیحدہ کر کے راجہ کی ذاتی جاگیرات، عمارات حتی کہ زیورات پر بھی خود قبضہ کر لیا۔ انہی زیورات میں "کوہ نور" نامی مشہور ہیرا بھی تھا جو اب تاج انگلستان کی زینت ہے۔ اہل پنجاب سے اسلحہ لے کر اندرونی امن و انتظام کے لیئے پولیس کا ایک بہت بڑا محکمہ قائم کیا گیا اور مالی اور عدالتی محکموں میں مفید اصلاحیں عمل میں آئیں۔ بیرونی حملوں سے حفاظت کے لیئے سرحد پر بہت سے نئے قلعے اور چھاونیاں بنا دی گئیں اور ایک خاص "گشتی فوج" (موبائل آرمی) مرتب کی گئی کہ وقت ضرورت بہ عجلت ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچ جائے [۵۱]۔

برما کی دوسری

ان ملکی انتظامات میں ڈلہوزی کے کئی سال صرف ہوئے اور ۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) میں ہندوستان کے دوسرے سرے پر جو جنگ چھڑی وہ بھی ایک حد تک اتفاقی واقعات کا نتیجہ تھی اور پہلے سے اس کا کوئی خاص ارادہ یا سامان نہیں کیا گیا تھا۔ اس جنگ کے جو اسباب انگریزی تاریخوں میں بیان کئے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی شکست کے باوجود برما کے راجہ کے غرور یا کم سے کم انگریزوں کے ساتھ اہانت آمیز سلوک میں چنداں فرق نہ آیا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں بعض انگریز سوداگروں پر زیادتیاں ہوئیں اور انکی طرف سے ڈلہوزی نے راجہ سے باقاعدہ شکایت اور تاوان دلانے کا مطالبہ کیا۔ راجہ نے ان مسلوں کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تو انگریز سفیر نے اپنی حکومت سے اجازت لیئے بغیر

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۳۵) "ہٹا کر اس کی بجائے سر چارلس نے پیئر کو مقرر کیا گیا" (ص ۴۶۵)

۵۱ اوکس ص ۷۰۰، ۷۰۱۔ زیورات کی ضبطی کے لیئے دیکھو کین جلد دوم صفحہ ۲۰۱۔

اہل برما کے ایک جہاز کو پکڑ لیا۔ برما والوں نے مزاحمت کی اور اسی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کی طرف سے باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا گیا (اپریل ۱۸۵۲ء ۱۲۶۸ھ)

اس لڑائی میں اہل برما انگریزی فوجوں کا کوئی قابل ذکر مقابلہ نہ کر سکے اور انگریزوں کا بلا وقت پیگو تک سواحل برما پر قبضہ ہو گیا۔ بایں ہمہ راجہ نے شرائط صلح ماننے سے قطعی انکار کیا اور نظامئے کمپنی کی رائے یہ ہوئی کہ پورے ملک پر قبضہ کر لیا جائے مگر ڈلہوزی نے یک بہ یک ایک غیر قوم کے اتنے وسیع علاقے کا الحاق کرنا مناسب نہیں سمجھا اور صرف جزیرہ نمائے پیگو اور ساحلی اضلاع کمپنی نے زیر نگین کر لئے جس سے ایک طرف تو سنگاپور تک خلیج بنگالہ کا پورا ساحل براہ راست انگریزوں کے قبضے میں آگیا اور دوسری طرف برما کا ملک ایک چھوٹی سی ریاست رہ گیا اور اس کی دفاعی قوت محدود و کمزور ہو گئی۔

ضبطی علاقوں کی پالیسی

ایک چھوٹی سی تعزیری مہم ۱۸۵۰ء میں سکھم کے راجہ کے خلاف بھیجی گئی، اس نے بعض انگریزوں کے ساتھ بدسلوکی کی سزا میں اس پہاڑی ریاست کا تھوڑا سا علاقہ چھین لیا گیا۔ اس کے سوا اور کوئی جنگی کارروائی ڈلہوزی کو نہیں کرنی پڑی۔ بایں ہمہ اس کے زمانے میں ہندوستان کے متعدد علاقے کمپنی کے قبضے میں آئے اور بہت سی دیسی ریاستوں پر انگریزوں کا براہ راست تصرف و تسلط قائم ہوا۔ اس قبضے کے لئے ڈلہوزی نے جو طریقہ اختیار کیا اسے ہم "قانون استغراق"[1] کہیں گے یعنی جب کسی ماتحت ریاست کا رئیس لاولد فوت ہو جاتا تھا تو کمپنی ریاست کا خاتمہ کر کے اس پر خود قابض ہو جاتی تھی۔

ڈلہوزی کے مذکورۂ بالا اصول پر انگلستان و ہندوستان میں بہت کچھ مباحثے ہو چکے ہیں۔ اکثر انگریز اہل الرائے اس قسم کی ضبطی کو بالکل جائز بلکہ عین مناسب بتاتے ہیں۔ اور بعض نے سخت الفاظ میں ڈلہوزی پر نکتہ چینی کی ہے کہ یہ طریقہ قزاقوں کے مناسب حال ہو تو ہو کسی سلطنت کے ارباب حکومت کے لئے ہرگز موزوں نہیں ہے[2] لیکن قانون استغراق کے جواز و عدم جواز کی اخلاقی بحث کو چھوڑ کر، اگر ہم اس کے سیاسی نتائج و عواقب پر غور کریں تو

---

[1] یعنی "ڈوکٹرن اوف لیپس" Doctrine of Lapse جس کا "قانون بازگشت" کے لفظ سے بھی ترجمہ کرتے ہیں لیکن ہمیں استغراق سے بہتر کوئی مرادف نہیں مل سکا۔

[2] مثلاً دیکھو مارٹن صفحہ ۶، ۴ وغیرہ

بھی ماننا پڑے گا کہ ایک غیر قوم کی رعایا میں اس قسم کے قوانین کا نفاذ دور اندیشی کے خلاف ہے۔ مگر اس طرزِ عمل کا صرف ڈلہوزی کو ذمہ دار قرار دینا، درست نہ ہوگا کیونکہ اوّل تو پہلے بھی دو ایک مرتبہ لاولد رئیسوں کی ریاستیں ضبط کی جا چکی تھیں دوسرے اوکلینڈ ہی کے زمانے میں کمپنی کا یہ اصولِ حکومت معرضِ تحریر میں آگیا تھا کہ "ہمارے سیاسی طریقِ عمل کا صاف اور واحد مقصود یہ ہونا چاہئے کہ ملکی مقبوضات اور آمدنی کے اضافے کا کوئی جائز اور مستحسن موقع ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ البتہ جو حقوق پہلے سے واجب ہیں ان کا احتیاط کے ساتھ احترام کیا جائے" اس کے علاوہ ڈلہوزی نے جتنی ریاستیں ضبط کیں ان سب کی اسے نظمائے کمپنی بلکہ خود حکومتِ انگلستان نے منظوری دی اور تائید کی[1]

الحاقِ ستارا، ناگپور، جھانسی وغیرہ

الغرض قانونِ استقراض کی رو سے ڈلہوزی نے جن ریاستوں کو ضبط کیا ان میں سب سے بڑی اور مشہور ستارا، ناگپور، اور جھانسی کی ہندو ریاستیں تھیں جن کے رئیس لاولد فوت ہوئے اور ان کے لئے پالک بیٹوں یا دوسرے عزیزوں کی وراثت کا حق تسلیم نہیں کیا گیا۔ اسی طرح جیت پور (بندھیل کھنڈ) سنبھل پور (اڑیسہ) اور بھگت وغیرہ کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ڈلہوزی نے ضبط کیں اور اسی ضمن میں آخری پیشوا باجی راؤ کا (جو لاولد فوت ہو گیا تھا) سالانہ وظیفہ بھی اس کے پس ماندوں کو دینا موقوف کر دیا۔ ریاستِ قرولی بھی قانونِ استقراض کی زد میں آگئی تھی مگر اس کی قدامت کی بنا پر نظمائے کمپنی نے اسے ضبط کرنا پسند نہیں کیا۔

اسی زمانے میں نواب اعظم الدولہ یا عظیم الدولہ کا انتقال ہوا۔ (۱۲... ۱۸۵۵ء) یہ نواب محمد علیخاں والئ کرناٹک کا وہی پوتا تھا جس نے عمدۃ الامرا کی وفات کے بعد خطاب نوابی لے کر حکومت و ریاست سے دست برداری لکھ دی تھی۔ اب اس کا یہ رسمی خطاب اور بعض اور مراعات بھی موقوف کر دی گئیں تاہم اس خاندان کا بزرگ ابھی تک احاطۂ مدراس کے دیسی رئیسوں میں سب سے اعلیٰ شمار ہوتا ہے۔

برار و اودھ

برار و اودھ کے الحاق کا معاملہ جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ "عہدِ معاونت" کی رو سے جو امدادی فوج نواب نظام الملک کو انگریزوں کے ماتحت رکھنی پڑتی تھی

[1] مارشمین صفحہ ۴۷۶، اکسس ص ۴۰

اس کے ادائی مصارف میں اکثر تاخیر اور دشواریاں پیش آتی تھیں۔ ریاست حیدرآباد کے عام انتظامات کے متعلق بھی کمپنی کے عہدہ داروں کو بہت سی شکایتیں تھیں لیکن ڈلہوزی نے ۱۸۵۳ء میں اسیقدر مداخلت پر اکتفا کی کہ ملک برار کو ٹھیکے کے طریق پر نواب نظام الملک سے لے لیا۔ یہی ٹھیکہ ہے جو بہت عرصے بعد لارڈ کرزن کے زمانے میں "دوامی" قرار دیا گیا اور اب اگرچہ برار اعلیحضرت نواب نظام الملک ہی کی ملک ہے لیکن اس نئے پٹے کی رو سے سرکار عالی کو اس کے مداخل و مصارف سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔

اودھ کی بدانتظامی کی وہاں کے انگریز ریزیڈنٹ بار بار شکایت کرتے رہتے تھے لیکن ۱۸۰۱ء کے معاہدے کے بعد فوجی مصارف کے عذر پر اس ریاست کا مزید علاقہ لینے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اور اگرچہ یہاں کے نام نہاد بادشاہوں کی نااہلی اور بدعنوانیاں واقعی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں لیکن رعایا پر ان کے ظلم و جبر کرنے کا الزام کچھ صحیح و درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس بات کی بھی بعض شہادتیں ملتی ہیں کہ مجموعی طور پر باشندگان اودھ کی خوش حالی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا بلکہ قریب کے انگریزی اضلاع سے بہت لوگ نقل مکان کر کے ریاست اودھ میں آبسے تھے۔[۱] کم سے کم عام باشندوں میں اس بات کی مطلق خواہش نہ تھی کہ شاہان اودھ کی بجائے وہاں کمپنی کی حکومت قائم ہو۔ اور جیسا کہ ایک انگریز مؤرخ نے لکھا ہے اگر واقعی ڈلہوزی کا خیال یہ تھا کہ اودھ کا الحاق وہاں کے لوگوں کے لئے موجب مسرت و شکر گزاری ہوگا، تو آئندہ واقعات نے اس کی بہت بری طرح تکذیب کی یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں عام اہل ملک نے سب سے زیادہ اودھ ہی میں انگریزوں سے عداوت و مخالفت کا اظہار کیا۔[۲]

لیکن اودھ کی بادشاہی کو مٹانے کا الزام ڈلہوزی کو دینا درست نہ ہوگا۔ نظمائے کمپنی اور حکومت انگلستان کو جو آخری مراسلات اودھ کے متعلق ڈلہوزی نے بھیجے ان میں وہاں کی بدنظمی کی شکایات لکھنے کے ساتھ اس بات کو بھی جتایا ہے کہ شاہان اودھ کمپنی کے ساتھ ہمیشہ خیر خواہی اور وفاداری کا سلوک کرتے رہے ہیں اور انھیں بادشاہی سے محروم کرنا

[۱] ملاحظہ ہو کین جلد دوم صفحہ ۱۷۰
[۲] کین جلد دوم صفحہ ۲۰۹

کمپنی کی سخت ناشکری اور بے انصافی ہوگی، البتہ ڈلہوزی کی یہ رائے ضرور تھی کہ اودھ کے انتظامات براہ راست انگریز عہدہ داروں کے حوالے کر دیئے جائیں اور نظم و نسق میں بادشاہ کا کوئی دخل نہ رہے۔ ہندوستان کے انگریز حکام کا ایک اور گروہ اس کارروائی کو بھی ناجائز اور معاہدات کی صریح خلاف ورزی جانتا تھا اور اس گروہ کے نزدیک اودھ کے اندرونی معاملات میں زیادہ سے زیادہ صرف اتنی مداخلت کی جا سکتی تھی کہ وہاں کے انتظامات ریزیڈنٹ یا کسی انگریز عہدہ دار کی نگرانی میں لے لئے جائیں لیکن سرکاری ملازمین جہاں تک ممکن ہو سب دیسی رہیں اور مداخل شاہی میں سے کمپنی خود ایک حبہ بھی وصول نہ کرے!

مگر وزرائے انگلستان اور نظمائے کمپنی نے اس تجویز کو نہ مانا اور ادھر بادشاہی کا خالی خطاب لے کر سلطنت انگریزوں کے حوالے کر دینے پر واجد علیشاہ رضامند نہ ہوا لہٰذا ڈلہوزی نے حکماً اُسے لکھنؤ سے ہٹا کر کلکتہ بھیج دیا اور اودھ کی "بادشاہی" کے خاتمے اور مقبوضات کمپنی میں داخل کر لئے جانے کا اعلان کرا دیا[1] (فروری ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۲ھ)

اودھ کا الحاق ڈلہوزی کا آخری سیاسی کارنامہ ہے اور اس کے تھوڑے ہی دن بعد وہ انگلستان واپس چلا گیا لیکن اندرونی نظم و نسق میں بھی اس کی بعض اصلاحات قابل یادگار ہیں۔ وہ نہایت ذہین و جفاکش آدمی تھا اور قریب قریب ہر شعبۂ حکومت کی بذات خود نگرانی رکھتا تھا۔ بعض عملی اصلاحات کے علاوہ بنگالے میں علیحدہ ایک "نائب گورنر" کا تقرر اسی کی تجویز سے ہوا (۱۸۵۴ء) ورنہ اس وقت تک گورنر جنرل ہی بنگالے کے مقامی انتظامات کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ نئے انتظامات

اسیطرح "امور عامہ" کا کام فوجی عہدہ داروں سے لے کر اسے ایک مستقل ملکی محکمہ بھی ڈلہوزی ہی نے بنایا اور بڑے پیمانے پر عمارات اور سڑکوں کی تیاری کا کام شروع کیا۔ ریلوں کو ہندوستان میں سب سے پہلے جاری کرنے کا فخر بھی اسی گورنر جنرل کو حاصل ہے اور اگرچہ اس کے زمانۂ حکومت میں بمبئی سے تھانہ اور کلکتہ سے رانی گنج (کوئلہ کی کان) تک فقط چند میل کی پٹری تیار ہوئی تھی لیکن ہندوستان کے بڑے بڑے مقامات تک

---

[1] مذکورۂ بالا واقعات کے لئے دیکھو مارشمین صفحہ ۴۸۲۔ اوکس ہس ۶۰۷ کیین جلد دوم ۲۰۸-۲۴۹

تعداد تو آیندہ معرکوں میں ہلاک ہوئی اور بعضے دستے بچ کر نیپال کے جنگلوں میں چلے گئے اور وہیں مر کھپ گئے۔ جو لوگ ہندوستان میں روپوش ہو گئے تھے اگرچہ اعلان شاہی کی رو سے انھیں معافی مل گئی لیکن سرکاری ملازمت اب اُن کو نہیں مل سکتی تھی۔ لہٰذا کہنا چاہیئے کہ کمپنی کی قدیم فوج کا کمپنی کی حکومت کے ساتھ ہی خاتمہ ہو گیا اور اب از سر نو دیسی فوج بھرتی کی گئی مگر یہ قاعدہ مقرر کر دیا گیا کہ شمالی ہند میں دیسی سپاہ گورہ فوج کی نسبت دو چند سے زیادہ نہ ہو۔ البتہ جنوبی ہند میں دیسی سپاہیوں کا شمار گورہ فوج سے سہ چند رکھا جائے۔ اسی کے ساتھ قرار پایا کہ آیندہ دیسیوں کو توپخانے میں کوئی ذمہ داری کی خدمت نہ دی جائے گی۔ پہلے فوج کو مدراس، بمبئی اور بنگال کے احاطوں کے نام سے تین علیحدہ علیحدہ حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا مگر کچھ عرصے بعد یہ تقسیم اڑا دی گئی اور کل فوج ایک ہی سپہ سالار کے ماتحت "افواج ہند" (انڈین آرمی) کے مجموعی نام سے موسوم ہونے لگی[۵۱]

نیل کا جھگڑا

۱۸۵۹ء کے اواخر (۱۲۷۵ھ) میں نیل کی کاشت کا قضیہ پیش آیا۔ دراصل بنگالے میں کچھ عرصے سے بعض انگریزوں نے زمینیں لے کر وسیع پیمانے پر نیل کی کاشت شروع کی تھی اور ہزاروں دیسی مزدوروں کو پیشگی روپیہ دے کر یہ اقرار نامے لکھوا لئے تھے کہ وہ ایک مدت معینہ تک اپنی نوکری نہ چھوڑ سکیں گے۔ پھر ان مزدوروں یا دیسی کسانوں پر انگریز زمینداروں کی طرف سے طرح طرح کی سختیاں ہونے لگیں اور وہ تنگ آ کر نوکریاں چھوڑ کر بھاگے تو اُن پر اور بھی جبر و تشدد کیا گیا۔ بنگالی زبان کا مشہور ناٹک "نیل درپن" انھی کسانوں کی افسوسناک حالت کا مرقع پیش کرتا ہے۔ بنگالے کا لفٹنٹ گورنر ڈھاکے سے واپس آتا تھا کہ ہزاروں کسان فریادیوں نے اُس کو گھیر لیا اور آخر ان کی آہ و زاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوئی۔ انگریز زمینداروں کی مظالم کی روایات صحیح ثابت ہوئیں اور اُن کے لکھوائے ہوئے اقرار ناموں کو قانوناً باطل و بے اثر قرار دیا گیا[۵۲]

۵۱ انگس میسن ص ۳۳۲ وغیرہ۔ واضح رہے کہ پہلے "احاطۂ بنگال" میں تمام شمالی ہند کے صوبے داخل تھے اور اسی سے نئے شمالی ہند کی تمام فوجیں "بنگال آرمی" ہی کے نام سے موسوم ہوتی تھیں۔

۵۲ انگس میسن صفحہ ۳۳۴، ڈاٹش مین ۵۲۴

کے ننگ کے آخری سال حکومت میں پنجاب، راجپوتانہ، صوبہ آگرہ اور کچھ کے علاقوں میں سخت قحط پڑا اور بعض اضلاع میں قریب قریب نوفیصدی آبادی فاقہ کشی سے ہلاک ہوگئی![1]

لارڈ ایلجن اول۔ مارچ ۱۸۶۲ء (۱۲۷۸ھ) میں نیا وائسرائے (لارڈ ایلجن اول) ہندوستان آیا لیکن دو سال کے اندر بیمار ہوکر فوت ہوگیا۔ اس کے عہد کا قابلِ ذکر واقعہ صرف یہ ہے کہ سرحدی قبائل کا قلع قمع کرنے کے لئے ایک انگریزی فوج روانہ کی گئی جسے بہت مصائب اور نقصانات برداشت کرنے پڑے اور یہ مقامی فساد بمشکل رفع دفع ہوا۔

سر جان لارنس۔ اسی سرحدی جھگڑے کی وجہ سے حکومت انگلستان سر جان لارنس کو وائسرائے بنانے پر آمادہ ہوگئی حالانکہ دستور یہ ہوگیا تھا کہ وائسرائے امرائے انگلستان کے طبقے کا آدمی ہو اور براہِ راست ولایت سے ہندوستان بھیجا جائے لیکن گو جان لارنس اب تک ہندوستان ہی میں مختلف ملکی عہدوں پر ملازم رہا اور طبقۂ امرا میں داخل نہ تھا پھر بھی اُسکی اعلیٰ قابلیت اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں بیش بہا خدمات مسلّم تھیں اور پنجاب و سرحد کے مسائل سے وہ بالخصوص نہایت عمدہ واقفیت رکھتا تھا۔ ڈلہوزی کا "قانونِ استقراض" بھی اسی کی رائے سے منسوخ ہوا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سب سے اوّل اسی کی دانشمندانہ کوششوں نے دیسی ریاستوں کے حاکموں کو فرمان روائے برطانیہ کا نہایت وفادار باج گزار اور بعض صورتوں میں حلیف بنا دیا۔ یہ لارنس ہی کی تحریک سے قرار پایا کہ میسور کا راجہ سنِ بلوغ کو پہنچ جائے تو حسبِ معاہدہ اس ملک پر سے انگریزی قبضہ اٹھا لیا جائے چنانچہ ۱۸۸۱ء میں اس کے مطابق عملدرآمد ہوا اور حکومتِ انگریزی کی فیاضی کی ایک بہت اچھی نظیر قائم ہوگئی۔

افغانستان میں انھی دنوں امیر دوست محمد خاں کے انتقال (۱۲۷۹ھ ۱۸۶۳ء) پر اس کی ... میں جنگ چھڑ گئی تھی اور بعض انگریز اہل الرائے اسے مداخلت کا

---

[1] ... صفحہ ۳۴۲۔

نہایت اچھا موقع سمجھتے تھے لیکن جان لارنس نے کابل کے اندرونی جھگڑوں میں حصہ لینے سے قطعاً انکار کیا اور تجربہ گواہ ہے کہ یہی حکمت عملی انگریزی سلطنت کے حق میں مفید و سود مند تھی ؛

اہل افغانستان کے ساتھ انگریزی تعلقات اور نزاع و جنگ کا حال آہستہ آتا ہے۔ یہاں لارنس کا یہ کارنامہ بیان کرنا ضروری ہے کہ جب ۱۸۶۶ء (۱۲۸۳ھ) میں اڑیسہ شمالی مدراس اور شرقی وسط ہند کے علاقوں میں پھر قحط پڑا اور لاکھوں آدمی اول فاقہ کشی سے اور بعد میں کثرت بارش کی دریائی طغیانیوں سے ہلاک ہو گئے تو گو جان لارنس ان مصائب کا بروقت انسداد نہ کر سکا تاہم اس نے امداد قحط زدگاں کے لئے جو تجاویز اور اصول قرار دیئے تھے وہ آیندہ نہایت عمدہ دستور العمل ثابت ہوئے اور امداد قحط زدگاں کے موجودہ ضوابط و قوانین جان لارنس ہی کے قرار دادہ اصول پر مرتب کئے گئے ہیں ؛

لارڈ میو جنوری ۱۸۶۹ء (۱۲۸۵ھ) میں لارڈ میو ہندوستان کا وایسرائے مقرر ہوا وہ آیرلینڈ کے طبقہ امرا کا رکن تھا اور نہایت لائق و مستعد گورنر جنرل مانا جاتا ہے دیسی رئیسوں کے ساتھ لارنس کے دوستانہ طریق عمل کو میو کی ذاتی خوبیوں سے بہت تقویت پہنچی اور دوست محمد خاں کے فرزند امیر شیر علی کو اسی نے ہندوستان میں مدعو کیا اور انبالے میں بڑی دھوم سے امیر موصوف کی دعوت کی۔ اسی ملاقات کے وقت قرار پایا کہ سرکار انگریزی بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور اسلحہ کی ایک مقررہ مقدار امیر کابل کو دیا کرے تاکہ روسیوں کے مقابلے میں وہ انگریزوں کا حلیف رہے حکومت انگلستان کی طرف سے بھی سلطنت روس پر زور ڈالا گیا کہ وہ بدخشاں بد امیر کابل کے حقوق بادشاہی تسلیم کرے اور دریائے جیحون سے آگے اپنا عمل دخل بڑھانے کی کوشش نہ کرے ۱۸۷۰ء

لارڈ میو نے مالیات ہند میں بہت سی مفید اصلاحیں کیں۔ دیسی ریاستوں کے امیرزادوں کے واسطے اجمیر، راج کوٹ، اور لاہور میں انگریزی تعلیم کے مدرسے قائم کئے اور قید خانوں کی اصلاح کی دھن تھی۔ خود جزیرہ انڈمان پہنچا تھا وہیں ایک سرحدی پٹھان کے ہاتھ سے جسے کسی انگریزی عدالت سے عبور دریائے شور

دی سزا ملی تھی) مارا گیا۔ (جنوری ۱۸۷۲ء ۱۲۸۸ھ)

دربارِ قیصری اور قحط لکھنؤ

میو کے جانشین لارڈ نارتھ بُرک کا زمانہ (۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۶ء ۱۲۹۳ھ) اہم تاریخی واقعات سے خالی ہے لیکن یہ تجویز کہ فرماں روائے انگلستان کے قیصر ہند ہونے کا شاہانہ طریق پر اعلان کیا جائے اسی والیسرائے نے کی تھی جس کی پارلیمنٹ نے بہت بیچارد و قدح کے بعد منظوری دی اور لارڈ لٹن کے عہد میں اس پر عمل ہوا یعنی سلاطین ہند کے قدیم پایۂ تخت دہلی میں ہندوستان کے رؤسا اور امرا کو جمع کر کے ایک بڑے دربار میں یہ اعلان کیا گیا کہ آئندہ سے ملکۂ وکٹوریہ "قیصرۂ ہند" کے لقب سے ملقب کی جائیں گی (جنوری ۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۴ھ)

مگر اس دربار قیصری کی دھوم دھام اور خوشی کو جنوبی ہند کے خوفناک قحط نے بے لطف کر دیا اور سال آئندہ اس قحط کے اثر سے وسط ہند اور شمالی ہند کے علاقے بھی محفوظ نہ رہے۔ انگریزی عہدہ داروں نے قحط زدہ رعایا کو مدد پہنچانے کی بہت کچھ کوشش و تدبیر کی انگلستان سے بھی لوگوں نے چندہ کر کے روپیہ بھیجا کیونکہ قحط کے سبب سے مہیب اثرات ہندوستان کے انہی علاقوں میں رونما ہوئے تھے جو براہ راست انگریزی حکومت کے قبضے میں تھے۔ مگر باوجود تمام انسدادی اور امدادی تدابیر کے اندازہ کیا گیا ہے کہ صرف انگریزی علاقے میں تقریباً پچاس لاکھ آدمی خوراک میسر نہ آنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے بری غذا نے جن لوگوں کو امراض وبائی میں مبتلا کر کے عدم کا راستہ دکھایا ان کا شمار اس کے علاوہ ہے[۵]

اس بلائے آسمانی کے شدائد سے ابھی تک ملک پنپنے نہ پایا تھا کہ افغانستان کی جنگ چھڑ گئی جس کی وجہ سے بعض انگریز مصنفوں اور خاص کر اس زمانے کے اخبار نویسوں نے لارڈ لٹن پر بہت کچھ نکتہ چینیاں کی ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ ہندوستان میں اتنی بڑی سلطنت اور قوت حاصل کرنے کے بعد

---

[۵] اوکس بی صفحہ ۹۰۴، نیز دیکھو ٹامسن کی مختصر تاریخ ہند صفحہ ۳۹۲ اور کیمبرج جلد دوم صفحہ ۲۰۷ جس میں امراض وبائی سے مرنے والوں کو ملا کر اتلاف جان کا کل شمار ستر لاکھ نفوس بتایا گیا ہے۔

مزید ممالک فتح کرنے کا شوق، قدرتی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ بالخصوص ایسے زمانے میں جبکہ ہند کی حکومت پر ایک ایسا شخص مامور ہو جو خود بھی شاعر تھا اور اس جادو بیان افسانہ نگار کا فرزند بھی تھا جس نے ایک قصے میں قدیم شہر پومپی آئی کے کھنڈروں کو اپنی اصلی دیرینہ شان میں ظاہر کرکے ان میں صدہا برس پہلے کی چہل پہل دکھائی تھی۔ ایسے شخص کو اگر ایشیا میں ایک عظیم الشان برطانوی سلطنت قائم کرنے کے خواب نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی دوسرے کابل سلاطین مغلیہ کا دو صدی تک صوبہ رہ چکا تھا۔ سلطنت روس کی اندیشہ ناک پیش قدمی دیکھکر بھی انگلستان کے بعض حامیان کشور کشائی، ہندوستان کی حفاظت کے لئے اس ملک پر قبضہ یا کسی حد تک عمل دخل رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ امیر شیر علی کے ساتھ لارنس و میئو کے دوستانہ روابط کو نارتھ برک کے ناگوار طرز عمل نے پہلے ہی درہم برہم کر دیا تھا اور اب امیر موصوف علانیہ روسیوں کی طرف مائل نظر آتا تھا[۱] پس لارڈ لٹن کو وزرائے انگلستان سے اس بات کی منظوری لینے میں کچھ بھی دشواری پیش نہ آئی کہ امیر کابل کو یا تو انگریزوں کی دوستی قبول کرنے پر مجبور کیا جائے ورنہ اس کو اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ سلطنت انگریزی کو اس کی جانب سے کوئی اندیشہ ہی باقی نہ رہے۔

لیکن امیر شیر علی اگر انگریزوں سے دوستی رکھنے پر آمادہ بھی تھا تو ۱۸۷۶ء (دسمبر ۱۲۹۳ھ) میں انگریزوں کے کوئٹہ پر قبضہ کر لینے سے نہایت برہم ہو گیا تھا۔ بلوچستان کے شمال کا یہ مقام خان قلات کی ریاست میں داخل تھا اور اسی سے مصالحانہ گفتگو کرکے لیا گیا لیکن جنوب مغربی افغانستان کے مرکزی شہر قندھار سے وہ صرف چند منزل کے فاصلے پر واقع ہے اور کوئٹہ سے درۂ بولان گویا بالکل زد میں آ جاتا ہے۔ پس انگریزی فوجوں کا ایسے مقام پر پہنچ جانا امیر کابل کو قدرتاً سخت ناگوار و موجب تشویش ہوا

---

[۱] اڈکس ہسن صفحات ۴۴، و ۵۱، و ۵۲، ۵۲

اسی واقعے کے بعد امیر شیر علی نے سلطنت روس سے باقاعدہ دوستی کے عہد و پیمان کئے اور ۱۸۷۸ء (۱۲۹۵ھ) میں روسی سفیر کا کابل میں بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔[1]

یہ خبر سن کر لارڈ لٹن نے بھی ایک سفیر کابل روانہ کیا تھا مگر امیر نے اس ناخواندہ مہمان کا استقبال کرنے سے انکار کیا اور اسی اہانت کی بنا پر سرکار انگریزی نے نومبر ۱۸۷۸ء (اواخر ۱۲۹۵ھ) میں کابل کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ساتھ ہی درہ خیبر، وادی خرم اور کوئٹہ سے تین انگریزی فوجیں افغانستان پر بڑھیں اور معمولی مزاحمت کے بعد جلال آباد و قندھار پر قابض ہو گئیں۔ خود امیر شیر علی اس لشکر کشی کی خبر سنتے ہی کابل سے نکل گیا اور بلخ میں روسی امداد کا منتظر تھا کہ بیمار ہو کر وفات پائی اور اس کے فرزند یعقوب خاں نے کچھ مجبوری سے اور کچھ ذاتی اغراض کی بنا پر انگریزوں سے صلح کر لی (عہد نامہ گندمک مرقومہ مئی ۱۸۷۹ء ۱۲۹۶ھ) جس کی اہم شرائط یہ تھیں کہ خیبر و بولان وغیرہ دروں پر انگریزوں کا قبضہ رہے گا ان کا ایک مستقل نائب (منسٹر، یا ریزیڈنٹ) کابل میں متعین کر دیا جائے گا اور حکومت کابل اپنے بیرونی معاملات میں سرکار انگریزی کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہ کر سکے گی۔ لارڈ لٹن کو قندھار پر قبضہ رکھنے یا اسے [illegible] کابل سے علیحدہ کر دینے کی خواہش تھی لیکن یعقوب خاں کے کہنے سننے سے یہ شرط معاہدے میں تحریر نہیں کی گئی۔

اس عہد نامے کے بموجب میجر کواگ نری کو کابل میں سفیر بنا کر بھیجا گیا لیکن لوگوں کے بڑے تیور دیکھ کر یعقوب خاں نے اسے کابل پہنچتے ہی اطلاع دیدی کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔ کواگ نری نے اس بات کی چنداں پروا نہ کی اور آخر نتیجہ وہی ہوا جس کا یعقوب خاں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ یعنی افغانی فوج کے بعض دستوں نے قلعے پر جہاں انگریزی سفیر مقیم تھا ایک [illegible] حملہ

---

[1] ادکس ہسٹری صفحہ ۷۵۲۔ وغیرہ

کیا اور سفیر اور اس کے سب ساتھی مارے گئے۔ (ستمبر ۱۸۷۹ء) [۵۱] انگریزی افواج قندھار میں موجود تھیں۔ اس حادثے کی خبر ملتے ہی **کابل** پر بڑھیں اور تھوڑی سی کشمکش کے بعد اس شہر پر قابض ہوگئیں۔ امیر یعقوب خاں خود انگریزی لشکرگاہ میں چلا آیا تھا لیکن **کابل** پر قابض ہوکر انگریزوں نے اس کی معزولی کا اعلان کر دیا اور تجویز کی گئی کہ اس ملک کو کئی چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم کردیا جائے [۵۲]

اس تجویز کے مطابق **قندھار** کو علیحدہ ریاست بنا کر امیر شیر علی کے ایک رشتہ دار کو وہاں کا رئیس منتخب کیا گیا اور گو شمالی افغانستان پر مستقل قبضہ کرنا ابھی تک مخدوش نظر آتا تھا لیکن اس حد تک وزرائے برطانیہ بھی آمادہ تھے کہ **قندھار** کو کم سے کم باج گزار ریاست کی طرح زیر نگین رکھا جائے اور وہاں کچھ عرصے انگریزی فوج رکھ کر شہر قندھار تک ہندوستانی ریل کا سلسلہ وسیع کردیا جائے [۵۳] مگر اوّل تو اسی زمانے میں وزارت برطانیہ میں تغیر ہوا جس کی وجہ سے لارڈ لٹن بھی مستعفی ہوگیا (اپریل ۱۸۸۰ء ۔ ۱۲۹۷ھ) دوسرے افغانستان میں امیر شیر علی کے ایک دوسرے بیٹے **ایوب خاں** نے بڑی قوت بہم پہنچائی اور خاص قندھار پر حملہ کیا جہاں انگریزوں کا سب سے زیادہ زور تھا۔ واضح رہے کہ اس تمام مدت میں کہ انگریزی فوجیں کابل و قندھار، غزنی و جلال آباد وغیرہ قلعوں پر قابض رہیں، آزادی پسند افغان خاموش نہیں رہے تھے بلکہ جب کبھی انگریزی فوجیں اپنے مورچوں سے باہر آتیں، تو اکثر ان کی افغانوں سے لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ انگریزوں کو قبضۂ کابل میں اس قدر مالی اور جانی نقصانات اٹھانے پڑے تھے کہ ایک طرف تو حکومت

---

[۵۱] ونسنٹ اسمتھ نے لکھا ہے کہ یعقوب خاں نے خود اقرار کیا تھا کہ انگریزی رزیڈنٹ کابل زیستا کو رہے (صفحہ ۷۰۵) لیکن اگر یہ صحیح ہو تو بھی اس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کیونکہ روایت کا اصلی اور ضروری جز یہ ہے کہ اگر چہ پہلے اصرار کیا تھا تو بعد میں یعقوب خاں نے خطرے کی اطلاع بھی دیدی تھی (مارشمین صفحہ ۴۲۶)

[۵۲] مارشمین صفحہ ۴۲۸ ۔ اوکس ہس ۷۵۲

[۵۳] مارشمین صفحہ ۴۲۸ ۔ اوکس ہس ۷۵۴

ہندوستان جنگی مصارف کے بارے سے دبی جاتی تھی اور دوسری طرف کابل میں جو ہندوستانی فوجیں مقیم تھیں ان میں سخت بے دلی پیدا ہو گئی تھی[۱] بایں ہمہ افغانی جنگجو بالکل بے سروسامان اور نہایت غیر منتظم حالت میں تھے اور اسلیئے انگریزوں کے آتشی اسلحہ اور کثرت سپاہ کے مقابلے میں ان کی جانبازی کارگر نہ ہوتی تھی۔ لیکن جس وقت ایوب خاں نے ہم وطنوں میں ایک حد تک انتظام و اتحاد قائم کر لیا تو جنگ کی صورت بدل گئی اور قندھار سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر انگریزی سپاہ کو ایک بڑے میدانی معرکے میں شکست کھا کے پسپا ہونا پڑا[۱] (جنگ میوند۔ جولائی ۱۸۸۰ء ۱۲۹۷ھ)۔

کابل سے فوراً انگریزی فوجیں مدد کے واسطے آپہنچی تھیں لیکن ادھر توان واقعات سے قبضۂ کابل کی دشواریاں بڑھ گئیں اور ادھر حکومت برطانیہ اور نیز نیئے وائسرائے لارڈ رپن کا منشا یہ تھا کہ جس طرح ممکن ہو اس جھگڑے سے پیچھا چھڑا لیا جائے۔ لہٰذا جب انہی دنوں امیر شیر علی کا بھتیجا امیر عبدالرحمٰن غالباً روسیوں کی امداد و تحریک سے، کابل پر بڑھا اور اپنی بادشاہی کا دعویدار ہوا تو انگریزوں نے بھی ایوب خاں اور افغانستان کو اس کے حوالے کر کے خود اس ملک سے نکل آنا غنیمت سمجھا اور اپریل ۱۸۸۱ء (۱۲۹۸ھ) تک کابل و قندھار کے سب علاقے خالی کر کے انگریزی فوجیں واپس چلی آئیں۔

اس طرح دو تین سال کی جنگی تدابیر اور جدوجہد کا وہ نتیجہ تو نہیں نکلا جسکی لارڈ لٹن کو آرزو تھی یعنی کابل و قندھار ایک طرف وادی خرم وغیرہ سے بھی انگریزی افواج کو واپس بلانا پڑا اور ملک افغانستان کو چند ریاستوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ تاہم ان لڑائیوں کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ریاست قلات انگریزوں کے زیر اثر آگئی اور کوئٹہ اُن کا مستقل مرکز جنگ بن گیا جہاں سے قندھار پر فوج کشی کرنا آسان ہے۔ نیز وادی خرم

[۱] مارش مین صفحہ ۳۸ و ۴۰ ۵ وغیرہ
[۲] اوکس ہن صفحہ ۵۳ ۷ وغیرہ

گویا اس کی زد میں ہے چنانچہ چند سال بعد آخر اس پر بھی سرکار انگریزی کا فوجی تسلط ہو گیا اور کوئٹہ کی طرح وہاں ایک مستحکم چھاؤنی (یہ مقام پارچنار) قائم کر دی گئی ہے[۵۱]۔

افغانستان کی جنگ کے خاتمے اور امیر عبدالرحمٰن کے ساتھ مصالحت نے یقیناً ہند و انگلستان کے بہت سے اہل الرائے کو لارڈ رپن کا شکر گزار بنا دیا لیکن ہندوستان میں اس کی ہر دلعزیزی کے، جس پر ونسنٹ اسمتھ اور اس کے ہم خیال انگریز حقارت آمیز حیرت کا اظہار کرتے ہیں[۵۲]، اور بہت سے اسباب تھے۔

اوّل تو اسی زمانے میں ریاست میسور وہاں کے راجہ کو واگذاشت کی گئی اور انگریزی عملداری جو پچاس برس سے میسور میں قائم تھی اٹھا لی گئی (۱۸۸۱ء – ۱۲۹۸ھ) دوسرے لارڈ لٹن دیسی اخبارات پر جو شدید قیود عائد کر گیا تھا رپن کے زمانے میں منسوخ کر دی گئیں (۱۸۸۲ء) تیسرے لارڈ رپن پہلا انگریز حاکم ہے جس نے اپنی ہندی رعایا کو "حکومت خود اختیاری" کے سوئے راستے پر ڈالا اور متعدد قوانین و ضوابط بنا کر مجالس بلدیہ و ضلعیہ (یعنی میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈز) میں اہل ہند کے دخل و اختیارات کو وسیع کیا (۱۸۸۳ء و ۱۸۸۴ء = ۱۳۰۱ھ) بس اگر ان مراعات سے اہل ہند لارڈ رپن کے گرویدہ ہو گئے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

اہل ہند کی احسان مندی کے مقابلے میں لارڈ رپن کے بعض ہموطن اس کی ان فیاضیوں کو خوف و بدظنی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جب اسی زمانے میں ایک نئے قانون کا مسودہ پیش ہوا جس کا منشا یہ تھا کہ اضلاع کی ہندوستانی عدالتوں کو انگریزوں کے مقدمات میں بھی تحقیقات اور فیصلہ

---

[۵۱] اوکس ہسٹری صفحہ ۷۵۴ ۔ مارش مین ۵۴۰

[۵۲] ونسنٹ اسمتھ نے یہی لکھا ہے کہ لارڈ رپن بالکل معمولی قابلیت کا آدمی تھا اور اپنے وطن میں سوائے اس کے کہ ایک تجربہ کار و مستعد اہل کار سمجھا جائے کوئی خاص شہرت حاصل نہ کر سکا، (اوکس ہسٹری صفحہ ۷۵۰) لیکن لائق مؤلف کو شاید اس بات کا احساس نہیں کہ ایک غیر قوم کی رعایا میں محض علمی قابلیت مقبول نہیں بلکہ کسی حاکم کی ہر دلعزیزی کا اصلی سبب عدل گستری، نیک نفسی اور فیاضی کی صفات ہوا کرتی ہیں۔

رپن کی ہر دلعزیزی

کرنے کا اختیار دیا جائے، تو ہندوستان کے انگریزوں میں لارڈ رپن کے خلاف ایک شور مچ گیا۔ اصلی مسودہ، کونسل کے رکن شعبہ قانون (مسٹر البرٹ) نے مرتب کیا تھا اور اسی کے نام سے تاریخ میں "البرٹ بل" کہلاتا ہے لیکن معترضین کو سب سے زیادہ غصہ لارڈ رپن پر آتا تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ یہی منصف مزاج وائسرائے چاہتا تھا کہ قانون کی نظر میں گورے کالے کا فرق باقی نہ رہے اور ہندوستان میں رہنے والے (غیر سرکاری) انگریزوں یا "برطانیہ کی فرنگی رعایا" کو جو مخصوص امتیاز حاصل ہے کہ ان کے مقدمے کی سماعت صرف انگریز حاکم عدالت ہی کر سکتا ہے، اُسے دور کر دیا جائے۔ لیکن اضلاع بنگالہ میں نیل کی کاشت کرنے والے انگریزوں نے "البرٹ بل" کی اس شدت سے مخالفت کی کہ آخر سرکار کو یہ مسودہ قانون واپس لینا پڑا اور قانون نافذ الوقت میں صرف خفیف ترمیم کر دی گئی۔ (۱۸۸۳ء = ۱۳۰۰ھ)

نیشنل کانگریس کی تاسیس

ہندوستان کے انگریزوں کی مذکورہ بالا مخالفت میں دیسی اخبارات اور ہندوستانی اہل الرائے نے لارڈ رپن کا ساتھ دیا تھا اور اس بحث مباحثے میں فریقین ایک دوسرے کے نہایت مخالف و معاند ہو گئے تھے۔ پھر جب کامیابی انگریزوں کے فریق کو ہوئی تو اہل ہند میں اور بھی ناراضی کا احساس پیدا ہوا اور انھی جذبات کو آئینی حدود کے اندر رکھنے کی غرض سے بعض آزاد خیال انگریز عہدہ داروں ہی نے اہل ہند کو ایک سیاسی انجمن بنانے کا مشورہ دیا جو "ممالک ہند کی قومی انجمن" یا "آل انڈیا نیشنل کانگریس" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اس کا پہلا اجلاس جنوری ۱۸۸۵ء (۱۳۰۲ھ) میں منعقد ہوا۔ اس انجمن کی تاسیس کا اصلی مدعا یہ تھا کہ ملک کے ہر حصے سے ہندوستانی اہل الرائے سال کے سال ایک مقام پر جمع ہوں، اپنے قانونی حقوق کے تحفظ کی تدابیر سوچیں اور تمام اہل ملک کی جانب سے اپنی آواز سرکار انگریزی کے اعلیٰ حکام تک پہنچائیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس انجمن کے سالانہ جلسوں نے اس سے بھی بڑھ کر جو کام کیا وہ یہ تھا کہ خود اہل ہند کو اپنے سیاسی حقوق سے آگاہ کیا اور ان میں سیاسی بیداری اور قومی خودداری پیدا کر دی۔

لارڈ ڈفرن ۱۸۸۴ء تا ۱۸۸۸ء

رپن کے جانشین لارڈ ڈفرن کے زمانے میں دوبارہ افغانستان میں مداخلت کا مسئلہ پیش آیا کیونکہ اب سلطنت روس کے ڈانڈے واقعی ملک افغانستان کی سرحدوں سے آملے تھے۔ روسی ریلیں عاشق آباد و سرخس تک جاری ہوگئی تھیں اور مرو کے روسی گورنر (علی خانوف) کے سپاہی درۂ ذوالفقار اور پل خشتی پر مورچے بنا رہے تھے جو امیر کابل کی سرحد سے بالکل متصل مقامات ہیں۔ پھر کابلی سپاہیوں کی ایک مقام (پنج دہ) پر اُن سے لڑائی بھی ٹھن گئی جسے کابلی اپنی سرحد کے اندر بتاتے تھے لیکن روسیوں نے حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا (۱۸۸۵ء ۱۳۰۲ھ)۔

اس واقعے نے ہند و برطانیہ کے انگریز مدبرین کو نہایت مشتعل کیا اور سلطنت روس کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کی جانے لگیں لیکن اگرلارڈ ڈفرن کے بعض مشیر افغانستان میں فوج بھیجنے پر آمادہ بھی تھے تو خود امیر عبدالرحمٰن نے اس کو گوارا نہیں کیا بلکہ راولپنڈی میں لارڈ ڈفرن سے مل کر صاف صاف جتا دیا کہ افغانستان خواہ تباہ و تاراج ہوجائے، انگریزی فوج کا افغانستان میں آنا ہمیں کسی صورت میں منظور نہ ہوگا۔ باقی سرکار انگریزی اگر افغانستان کی روسیوں کے مقابلے میں پشت پناہ ہونا چاہتی ہے تو جس قدر ہوسکے روپیہ اور جنگی ساز و سامان سے اہل افغانستان کی مدد کرے تاکہ وہ خود روسیوں کی پیش قدمی روک لیں۔ لارڈ ڈفرن کو بھی مصلحت اسی طریق عمل میں نظر آئی اور امیر عبدالرحمٰن خاں بارہ لاکھ روپیہ سالانہ کی امدادی رقم کی تجدید و توثیق اور کثیر ساز و سامان جنگ کے ساتھ خوش خوش کابل واپس گیا اور جب آبادہ اس نے "دولت خداداد و دولت برطانیہ" کے اتحاد کا عام اعلان کردیا۔ سرحد کابل و روس کا تنازعہ کچھ عرصے بعد فریقین کی باہمی گفتگو سے مصالحانہ طریق پر طے ہوگیا۔[۱]

الحاق برما

سرحد ہندوستان کے دوسرے سرے پر برما کا ملک گھٹتے گھٹتے اب ایک

[۱] ادکس ص ۷۵۹۔ مارشمین ۴۷ و ۴۹۶ وغیرہ

چھوٹی ریاست رہ گیا تھا مگر وہاں کا راجہ (تھی بو) انگریزوں کے ساتھ گویا موروثی عداوت رکھتا تھا اور اس نے انھی دنوں فرانسیسیوں کے ساتھ میل جول بڑھانا شروع کیا تھا؛ ڈفرن کو یہ باتیں سخت ناگوار گزریں۔ اتفاق سے اسی زمانے میں راجہ نے ایک انگریزی کمپنی پر کئی لاکھ روپیہ جرمانہ کیا۔ اور جب سرکار انگریزی نے اس سے شکایت کی تو معمولی جواب دے کے ٹالنے کو ٹال دیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے ڈفرن اس ریاست کا خاتمہ کرنے کا پہلے سے ارادہ کر چکا تھا لہٰذا انگریزی کمپنی کے معاملے کو لڑائی کا سبب قرار دے کر اُس نے جنگ کا اعلان کر دیا (۱۸۸۵ء) انگریزی افواج کی پیشقدمی کی اہل برما کوئی بڑی مزاحمت نہ کر سکے اور چند ہفتے میں پائے تخت مانڈلے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ راجہ تھی بو کو معزول کر کے ہندوستان لے آئے اور جنوری ۱۸۸۶ء (۱۳۰۳ھ) میں برما کے سلطنت انگریزی میں الحاق کا اعلان کر دیا گیا۔

اہل برما میں افغانوں کی طرح جنگ و جانبازی کا عام جوش نہ تھا اور نہ ان میں کوئی بہادر سردار ایسا پیدا ہوا جو اپنے ہم وطنوں کو قومی آزادی کی خاطر انگریزوں کے مقابلے پر آمادہ کر دیتا۔ تاہم برمی فوج کے برطرف شدہ سپاہی اور قزاقوں کے بعض گروہ بہت دن تک انگریز حکام کو پریشان کرتے رہے اور کامل امن و تسلط الحاق کے پانچ سات سال بعد قائم ہو سکا۔ پھر ۱۸۹۷ء (۱۳۱۴ھ) میں شمالی اور جنوبی برما کو ملا کر ہندوستان کا ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا۔

ڈفرن کے عہد کے دو واقعات اور قابل ذکر ہیں؛ ایک تو یہ کہ ریاست گوالیار سے جھانسی لے کر مرار کا مقام اور گوالیار کا مشہور قلعہ اس ریاست کے حوالے کر دیا گیا۔ اور دوسرے اوائل ۱۸۸۷ء (۱۳۰۴ھ) میں برطانیہ کی ہر دلعزیز ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کی پنجاہ سالہ "جوبلی" (یا سالگرہ) منائی گئی۔ اور ہندوستان کے ہر شہر میں دھوم دھام کے جلسے ہوئے۔

الحاق برما کے بعد، بقول "ونسنٹ اسمتھ"، کوئی اور علاقہ تو ایسا باقی نہیں رہا تھا کہ جسے لیکر ہندوستان کے انگریز حکام اپنے مقبوضات میں مزید

سرحدی لڑائیاں

توسیع کرتے۔ البتہ سرحد کابل کی طرف بہت سے جنگی مسائل تصفیہ طلب تھے اور "کشورستانی" کا ایک محدود میدان موجود تھا لیکن اس بارے میں ڈفرن کے جانشین لارڈ لینس ڈاون پر ہندوستانی اخبار نویسوں اور کانگریس والوں نے جو اعتراضات کی بوچھار کی تھی، اس میں بظاہر ایک حد تک بیجا عیب جوئی اور نافہمی کا بھی دخل تھا۔ درحقیقت امیر عبدالرحمن خاں کی قوت مستحکم ہونے کے بعد وقت کے وقت اس بات کا کوئی قرینہ نہ رہا تھا کہ ملک افغانستان پر انگریزوں کا براہ راست یا بالواسطہ تسلط قائم ہو جائے گا۔ لہذا ضرورت تھی کہ اپنی ہندوستانی سرحد کو ایسے طریقے سے معین و مستحکم کیا جائے کہ اگر دولت کابل انگریزوں کی محکوم نہ ہو سکے تو بھی انگریزوں کے حملے سے ایک حد تک خائف و اندیشہ مند رہے۔ لینس ڈاون اس سرحد کو کوہستان سلیمان کے مغربی پہلو پر قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ درہ خیبر کی خاطر خواہ حفاظت ہو سکے اور اگرچہ اس منصوبے میں "آزاد سرحدی" قبائل سے لڑائیوں کا اندیشہ تھا، نیز جذبۂ "کشورستانی" کی جھلک پائی جاتی ہے۔ بایں ہمہ نہ صرف سلطنت انگریزی کی شان بلکہ دفاعی ضروریات کو پیش نظر رکھا جائے تو غالباً تسلیم کرنا پڑے گا کہ لینس ڈاون کی تجویز قابل تعریف تھی نہ کہ لائق اعتراض۔ اسی طرح بلوچستان میں انگریزی نفوذ کو ترقی دینے کے متعلق جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں، وہ بھی چنداں وقیع نہیں معلوم ہوتیں۔ سچ پوچھیے تو کوئٹہ پر انگریزی قبضہ ہونے کے وقت ہی یہ علاقے سرکار انگریزی کے زیر اثر ہو گئے تھے۔ البتہ یہ مسئلہ صاف نہیں ہوا تھا۔ اور افغانستان میں ایک مستقل حکومت قائم ہونے کے بعد یہ کمی یا بے قاعدگی اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ لینس ڈاون کو اس کا دور کرنا ضروری معلوم ہوا اور اس نے امیر کابل سے گفتگو کے بعد ان بلوچستانی علاقے کے باقاعدہ انگریزی تسلط میں ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس "الحاق" میں بہت کم نئے اضلاع شامل تھے ورنہ زیادہ تر وہی علاقہ سرکار انگریزی کے پاس رہا جو لارڈ لٹن کے زمانے سے انگریزوں کے اثر میں آچکا تھا۔

بہر حال، جہاں تک امیر کابل سے معاملت کا تعلق تھا، لارڈ لینس ڈون کی کوششیں خاطر خواہ کامیاب ہوئیں۔ ڈورینڈ اور سینڈیمن جیسے لائق ہاتھوں کی مدد سے بلوچستانی اور شمالی سرحد اچھی طرح معین کرائی گئی۔ امیر عبد الرحمن خاں نے کوئٹے سے چالیس پچاس میل آگے تک انگریزوں کا قبضہ تسلیم کرلیا اور کوہستان سلیمان کے سرحدی قبائل کے علاقے پر جو حاکمانہ حقوق، دولت کابل کو حاصل تھے اُن سے بھی دست بردار ہوگیا۔ یہ "حقوق" دراصل محض رسمی تھے، ورنہ کابل ہو یا ہندوستان کسی ملک کی حکومت بھی ان آزاد جنگجو قبائل کو آسانی سے کبھی اپنے قابو میں نہیں لاسکی تھی۔ لہذا اس پہاڑی علاقے کو انگریزوں کے حوالے کرنے سے، دولت کابل کا کوئی نقصان نہیں ہوا مگر اسکے معاوضے میں امیر نے اپنی سالانہ امدادی رقم میں ۶ لاکھ کا اضافہ کرالیا ؟

لیکن سرکار انگریزی کو اصلی زحمت اور پریشانی ابھی سرحدی قبائل کو محکوم کرنے میں پیش آئی لینس ڈون تو چھٹے سال عہدے سے دستکش ہو کر ولایت روانہ ہوگیا (۱۸۹۴ء ۱۳۱۲ھ) اور بلوچستان کا جہاں تک تعلق ہے، ادھر کے بلوچ قبائل بھی خاصی طرح انگریزوں کے مطیع و زیر نگیں ہوگئے مگر شمال میں جب مذکورہ بالا تجویز کے مطابق خیبر اور کوہستان سلیمان کی بلندیوں پر انگریزی چوکیاں قائم کی گئیں، تو وہاں کے "افریدیوں" سے جنگ و جدال کا وہ سلسلہ چھڑ گیا جو درحقیقت آج تک ختم نہیں ہوا ہے ؟

چنانچہ اوّل تو لینس ڈون کے جانشین لارڈ الجن (ثانی) (۱۸۹۴ء تا ۱۸۹۹ء ۱۳۱۷ھ) ہی کو وسیع پیمانے پر ان سرحدیوں کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی جنھوں نے ۱۸۹۷ء (۱۳۱۴ھ) میں چترال سے بلوچستان تک لڑائی کی آگ بھڑکا دی تھی اور چک درا، سراگرھی، ٹوچی وغیرہ کئی پہاڑی مقامات پر انگریزی فوجوں کو سخت نقصان پہنچائے تھے۔ اس لڑائی کا سلسلہ، جسے جنگ تیراہ یا "مہم تیراہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، دو سال تک جاری رہا۔ اوّل تو ان پہاڑی اور سرد مقامات کو فتح کرنا کچھ آسان نہ تھا دوسرے انگریزوں کے مقابلے میں عمدہ اسلحہ اور قواعد جنگ کی کمی کو افریدیوں نے

اپنے مذہبی جوش اور جانبازی سے خاصی طرح پورا کر دیا تھا اور جا بجا وہ ایسی بہادری سے لڑے کہ انگریزی فوجوں کی ہمت پست ہوگئی۔ پھر جان و مال کے کثیر نقصانات کے بعد اکثر قبائل مغلوب یا صلح پر آمادہ ہوگئے اور ۱۸۹۸ء میں "جنگ" کے حسب دلخواہ ختم ہونیکا اعلان ہوا تو بھی درحقیقت ان سرحدی پہاڑیوں کی شورہ پشتی میں فرق نہیں آیا۔ اور تازہ ترین تاریخ کے انگریز مؤلف کو اعتراف ہے کہ "ان قبائل کی کامل اطاعت آج بھی اسی قدر دور و بعید نظر آتی ہے جتنی کہ ہمیشہ سابق میں دور تھی"[۵۱] حتی کہ چند سال بعد لارڈ کرزن کو (۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۵ء = ۱۳۲۲ھ) لینس ڈاؤن کے جنگی منصوبے میں ترمیم کرنی پڑی اور "مصالحانہ نفوذ" کا وہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی جو بلوچستان میں سینڈیمن نے اختیار کیا اور کامیابی حاصل کی تھی۔ چنانچہ اس وایسرائے نے (سرحدی) انتظام کے اصول یہ قرار دیئے کہ "بڑھی ہوئی فوجی چوکیوں سے انگریزی فوج واپس ہٹالی جائے۔ قبائل سرحدی کے علاقے کی حفاظت کے واسطے خود قبائل ہی کی فوجوں سے کام لیا جائے اور ان کی امداد و حفظ ماتقدم کی غرض سے، انگریزی فوجیں ان (قبائل کی فوجوں) کے عقب میں فراہم رکھی جائیں اور ان عقبی مقامات میں ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنایا جائے"

"اس حکمت عملی کی بدولت سرحدی قبائل کی ایک معقول جمعیت (ملیشیا) کو فراہم و مرتب کرنا پڑا لیکن اس کا کامیاب ہونا ہی اس کی خوبی کا ثبوت ہے۔ اور لارڈ کرزن کے زمانے میں صرف ایک لڑائی محسودیوں سے پیش آئی۔ سوا اسے بھی اہمیت چھپانے کی غرض سے (سرکاری طور پر) فقط "ناکہ بندی" کے نام سے موسوم کر دیا گیا تھا"[۵۲]

لارڈ کرزن کی [illegible]

یہ وایسرائے جس نے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کا مذکورۂ بالا انتظام کیا، ابھی تک (۱۹۳۲ء) زندہ اور سلطنت برطانیہ کے ارباب حل و عقد میں داخل ہے اور بے شبہ ذاتی قابلیت اور ذہانت کے اعتبار سے اسے ہندوستان کے سب سے

---

[۵۱] اوکس ہسٹری صفحہ ۷۶۰، جنگ تیراہ کے حالات میں دیکھو کیمبرج جلد دوم ۳۵۶ وغیرہ

[۵۲] اوکس ہسٹری صفحہ ۷۷۲۔ انہی سرحدی قبائل کو خاطر خواہ قابو میں لانے کی غرض سے لارڈ کرزن نے "شمال مغربی سرحدی صوبہ" علیحدہ بنایا تھا (۱۹۰۱ء) جس کا چیف کمشنر براہ راست وایسرائے کے ماتحت ہوتا ہے۔

مشہور وسیرائوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ اہل ہند عام طور پر لارڈ کرزن سے ناراض رہے اور اس ناراضی کی بہت سی وجوہ تھیں:۔

(۱) اول تو انہی آٹھ برسوں میں ہندوستان کے لوگوں کو قحط و طاعون کی آسمانی بلاؤں سے وہ تکلیف و مصیبت اٹھانی پڑی کہ شاید پہلے کبھی پیش نہ آئی ہوگی تاریخی طور پر شاہ جہانگیر کے عہد میں وبائے طاعون کے پھیلنے کا ثبوت ملتا ہے اور اس موقع پر بھی اس وبا نے لکھوکھا آدمیوں کی جان لی اور ہندوستان خاص کے اکثر مقامات میں سخت تہلکہ ڈال دیا تھا۔ مگر یہ وبا چند سال میں دفع ہوگئی۔ برخلاف اس کے لارڈ ایلجن کے زمانے میں جس طاعون (بیوبونک پلیگ) کا بمبئی سے آغاز ہوا (سنہ ۱۸۹۶ء = سنہ ۱۳۱۳ھ) وہ رفتہ رفتہ ہندوستان کے ہر حصے میں پھیل گیا اور آج چھبیس برس بعد بھی اس کے بالکل دفع ہو جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے لیکن شاید طاعون سے بھی بڑھ کر پریشان کن سنہ ۱۸۹۷ء اور سنہ ۱۹۰۰ء کے خوفناک قحط تھے جنھوں نے ہندوستان خاص اور وسط ہند کے علاقوں میں سخت تباہی اور ہلاکت پھیلا دی۔ ان قحطوں میں لاکھوں آدمی بھوک سے مرے جنکی اس قدر حالت خراب نہ تھی وہ بھی فاقہ کشی اور گرانی کی تکلیف سے محفوظ نہ تھے اور ان مصائب نے عام طور پر اہل ہند میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کر دی تھی۔

(۲) مگر خود وسیرائے سے لوگوں کی ناخوشی کا پہلا سبب وہ کوششیں تھیں جو خلیج فارس اور تبت میں انگریزی اثر بڑھانے کی غرض سے لارڈ کرزن نے کیں۔ ان میں پہلی کوشش تو برطانیہ کی بحری قوت اور حکومت ایران کی کمزوری کی وجہ سے جنگ و جدال کی نوبت آئے بغیر خاصی کامیاب ہو گئی۔ لیکن تبت پر جو فوجی مہم بھیجی گئی تھی اسے وہاں کے پائے تخت لاسا تک پہنچنے میں ... مقابلہ کرنے پڑے اور اگرچہ لاسا پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن آخرکار سلطنت چین سے جنگ چھڑ جانے کے اندیشے سے مہم کو واپس بلانا پڑا اور ... کے بقول جغرافی معلومات حاصل کرنے کے سوا اس غیر ضروری مہم بھیجنے کا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا ۱ (سنہ ۱۹۰۴ء = سنہ ۱۳۲۱ھ)

مہم تبت و تقسیم بنگال وغیرہ

---

۱ اوکسفرڈ ہسٹری صفحہ ۷۷۱

ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھی لارڈ کرزن کے زمانے میں سرکار انگریزی کی مداخلت اور نگرانی بڑھ گئی۔ جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں برار کا دوامی پٹہ اسی وائسرائے کے عہد میں ہوا۔ مگر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سب سے زیادہ جو بات ناگوار گزری وہ لارڈ کرزن کا نیا "قانونِ جامعات" (یونیورسٹیز ایکٹ) مجریہ سنہ ۱۹۰۴ء (سنہ ۱۳۲۱ھ) ہے جس نے تعلیمی معاملات میں سرکار کے دخل و اختیار کو بہت بڑھا دیا اور ہندوستانی اہل الرائے نے عام طور پر اس قانون کو اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کے منافی اور مخالف قرار دیا۔ ابھی یہ ناراضی کم ہونے نہ پائی تھی کہ لارڈ کرزن نے (چند مہینے ولایت میں رہ کر، دوبارہ ہندوستان آتے ہی) "تقسیم بنگال" کا اعلان شائع کیا (سنہ ۱۹۰۵ء = سنہ ۱۳۲۲ھ)

اس میں شبہ نہیں کہ بنگال کا صوبہ جس میں اُن دنوں بہار و اڑیسہ بھی داخل تھے بہت بڑا تھا اور مشرقی بنگال کو علیحدہ صوبہ بنانے سے وہاں کے مسلمانوں کو بھی ایک حد تک فائدہ پہنچنے کی امید تھی لیکن ہندو بنگالی اس تقسیم کے نہایت مخالف تھے اور ان کا قول تھا کہ اس تقسیم سے بنگالی قوم کی متحدہ قوت کو توڑنا اور اہل بنگال میں باہمی اختلاف پیدا کرنا مقصود ہے۔ تھوڑے دن بعد اس مخالفت نے تحریر و تقریر سے گزر کر قاتلانہ سازش کی خطرناک صورت اختیار کر لی یعنی بنگالے میں بعض اس قسم کی خفیہ انجمنیں بنائی گئیں جن میں بم سازی کی تعلیم اور انگریز عہدہ داروں کو قتل کرنے کی تدابیر سوچی جاتی تھیں۔ یہ خیالات آخر میں پنجاب و مہاراشٹر کے نوجوانوں تک پہنچ گئے لیکن اس قسم کے قتل و خون کی زیادہ واردا تیں بنگالے ہی میں ہوئیں۔ انجام کار لارڈ کرزن کی "تقسیم بنگال" کو منسوخ کرنا پڑا اور مشرقی بنگال کی بجائے صرف بہار و اڑیسہ کو ملا کر ایک جداگانہ صوبہ بنا دیا گیا (سنہ ۱۹۱۲ء = سنہ ۱۳۳۰ھ)

آثار قدیمہ اور شاہی دربار

لارڈ کرزن کے شاہانہ مزاج سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ ہندوستان کی قدیم شاہی عمارات کی حفاظت و نگرانی کا سرکار کی طرف سے معقول انتظام کر دیا گیا اور ہر صوبے نیز بعض بڑی ریاستوں میں "آثار قدیمہ" کے مستقل محکمے قائم ہوئے جن کے عہدہ داروں کا کام ہی یہ ہے کہ قدیم عمارات، کتبات وغیرہ کی تلاش اور انکے تحفظ و بقا کی کوشش کرتے رہیں اور اس کام کے لئے [illegible]

بہت سا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔

لارڈ کرزن کے زمانے کے دو قابل ذکر واقعے جن کا ترتیب سنین کے اعتبار سے اوپر ذکر آنا چاہیئے تھا، یہ ہیں کہ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء[1] میں ملکہ وکٹوریہ نے وفات پائی اور شاہ اڈورڈ ہفتم تخت نشین ہوئے۔ مگر بعض ناگزیر وجوہ سے انگلستان میں سنہ ۱۹۰۲ء سے پہلے تاجپوشی کا جشن منعقد نہ ہو سکا۔ اسی لیئے ہندوستان میں بھی یہ رسم سنہ ۱۹۰۲ء کے اخیر بلکہ جنوری سنہ ۱۹۰۳ء میں منائی گئی۔ اس غرض سے دہلی میں بڑی دھوم دھام کا "دربار تاجپوشی" منعقد ہوا اور اس میں ہندوستان کے اکثر رئیس، راجہ و مہاراجہ، نواب و اُمرا مدعو کیئے گئے۔ پھر دس برس بعد جب شاہ اڈورڈ ہفتم نے وفات پائی تو اسی قسم کا دوسرا شاہی "دربار" دوبارہ سنہ ۱۹۱۲ء کے اوائل میں منعقد ہوا اور اس کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ اس دربار میں خود قیصر ہند شاہ جارج پنجم ہندوستان تشریف لائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بادشاہ انگلستان ہندوستان میں آکر جشن تاجپوشی منعقد کریں۔ ممالک ایشیا کی تاریخ میں اس کو ایک یادگار واقعہ سمجھنا چاہیئے۔

مگر اپنی تاریخ کے سلسلے کو قائم رکھنے کے لیئے ہمیں مختصر طور پر یہ بیان کر دینا چاہیئے کہ لارڈ کرزن کا جانشین منٹو (ثانی) ہوا (سنہ ۱۹۰۵ء تا سنہ ۱۹۱۰ء = سنہ ۱۳۲۸ھ) اور بنگالے اور دیگر مقامات کی شورش کے انسداد کی غرض سے "قانون مجالس باغیانہ" اور "قانون اخبارات" اسی وائسرائے کے عہد میں نافذ ہوئے۔ خفیہ پولیس کے محکمے میں بہت توسیع و ترقی دی گئی اور تحریر و تقریر کی آزادی پر سخت قیود عائد کر دی گئیں کہ شورش انگیزوں کی خطرناک کوششوں کا سد باب ہو۔ مگر سچ پوچھیئے تو اہل ہندوستان کی شورش و ناراضی کو دفع کرنے کی سب سے بہتر تدبیر اُن "آئینی اصلاحات" (مجریہ سنہ ۱۹۰۹ء = سنہ ۱۳۲۷ھ) کا نفاذ تھا جن کی بدولت اہل ہند کو سرکاری معاملات میں حصہ لینے کا پہلے سے زیادہ موقع ملا، اور مجموعی طور پر اُن کی سیاسی قدر و منزلت بڑھ گئی۔

لارڈ منٹو، لارڈ ہارڈنگ، چیمسفورڈ

---

[1] اسی سال (سنہ ۱۹۰۱ء) امیر عبدالرحمن خاں والی کابل کا انتقال ہوا اور امیر حبیب اللہ خاں اس کے جانشین ہوئے اور تھوڑے دن بعد سرکار انگریزی نے تسلیم کر لیا کہ نئے امیر کو سرکاری طور پر "ہز مجسٹی" کے بادشاہی لقب سے مخاطب کیا جائے۔

لارڈ منٹو کے جانشین لارڈ ہارڈنگ (ثانی) سنہ ۱۹۱۱ء تا سنہ ۱۹۱۶ء
سنہ ۱۳۳۴ھ) کے عہد حکومت کا ایک مشہور واقعہ تو دہلی شاہی دربار ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ مگر جنگ ہائے طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے ہنگامے سے نئے ہندوستانی مسلمانوں میں عام ہیجان پیدا ہونے کے علاوہ، لارڈ ہارڈنگ کے زمانے کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۱۴ء (سنہ ۱۳۳۲ھ) میں دول یورپ کے درمیان جنگ عظیم چھڑ گئی اور اس میں شرکت کے لیئے ہندوستانی افواج بتعداد کثیر یورپ، افریقہ اور عراق عرب روانہ کی گئیں جہاں انھوں نے بڑے بڑے کارنمایاں انجام دیئے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں جب لارڈ ہارڈنگ کی میعاد حکومت ختم ہوئی تو ہندوستان کی حکومت لارڈ چیمسفورڈ کو دی گئی۔ اس وائسرائے کے عہد میں بھی کئی سال تک یورپ کی جنگ جاری رہی اور آخر اس کا فرانس و برطانیہ کی فتح و کامیابی پر اختتام ہوا لیکن ہندوستان کی تاریخ میں لارڈ چیمسفورڈ کا عہد سب سے زیادہ اس وجہ سے یادگار رہے گا کہ اہل ہند میں اپنی وطنی یا قومی حکومت قائم کرنے کا خیال اسی زمانے میں پھیلا اور ان کے سیاسی مطالبات و مقاصد میں بہت بڑا تغیر پیدا ہو گیا۔ دوران جنگ میں اہل ہند نے سلطنت برطانیہ کی جس جانثاری کے ساتھ خدمت کی اور نہایت نازک وقت پر جان و مال سے مدد دی اس کا برطانیہ کے بڑے بڑے مدبرین اور وزراء نے بھی اعتراف کیا لیکن ادھر تو ہندوستان میں بعض نئے اور سخت قوانین خاص کر قانون رولٹ، کے نفاذ سے لوگ بہت برہم ہوئے اور ادھر سلطنت عثمانیہ کی شکست اور بعد میں ترکوں کے ساتھ حکومت برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے برتاؤ سے ہندوستانی مسلمانوں کو نہایت مایوسی اور اشتعال ہوا۔ ان اسباب نے ہندو مسلمانوں کو سیاسی مطالبات میں باہم متحد کر دیا اور جب ان کے سیاسی شور و شغب کو روکنے کے لیئے سختی کی گئی؛ مثلاً پنجاب کے چند اضلاع میں "جنگی قانون" (مارشل لا) کا نفاذ ہوا۔ صد ہا اشخاص سرکار سے ناراضی پھیلانے کے الزام پر گرفتار کیئے گئے۔ کئی مقامات پر ہوائی جہازوں سے بم کے گولے برسائے گئے۔ مشتبہ مجمعوں کو منتشر

کرنے کے لئے کئی بار "مشین گن" استعمال کی گئی اور اس میں سب سے زیادہ سختی شہر امرتسر کے "باغ جلیان والا" میں ہوئی جہاں کسی میلے یا جلسے میں جمع ہونے والوں پر ایک انگریز افسر (جنرل ڈائر) نے باڑیں مارنے کا حکم دیا اور صدہا آدمی ہلاک اور مجروح ہوئے تو ان واقعات نے سیاسی شورش کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ پھر ہر چند لوگوں کا جوش فرو کرنے کی کوشش کی گئی اور ۱۹۲۰ء ۱۹۱۹ء (۱۳۳۸ ۱۳۳۹ھ) میں جدید "آئینی اصلاحات" نافذ ہوئیں جن کی رو سے اہل ہند کو بہت سے نئے سیاسی حقوق حاصل ہوئے لیکن ان کے گروہ کثیر نے ان اصلاحات کو ناکافی قرار دیا اور آج تک اس گروہ کے سیاسی مطالبات اور خود مختار حکومت حاصل کرنے کی کوشش و شورش میں کوئی نمایاں کمی نہیں آئی ہے۔

مذکورۂ بالا آئینی اصلاحات کا حال اس باب کی آخری فصل میں ہماری نظر سے گزریگا سلسلۂ بیان کو ختم کرنے کے لئے یہاں اس قدر اضافہ کردینا چاہئے کہ اسی زمانے میں دولت کابل سے معمولی اختلافات کی بناء پر لڑائی چھڑی مگر زیادہ خطرناک صورت اختیار کرنے سے پہلے فریقین میں صلح ہوگئی اور سرکار انگریزی نے کابل کی کامل خود مختاری کو تسلیم کرلیا (۱۹۱۹ء ۱۹۲۰ء ۱۳۳۸ ۱۳۳۹ھ)

۱۹۲۱ء (۱۳۳۹ھ) میں لارڈ چیمز فورڈ کی میعاد حکومت ختم ہوگئی اور اب انگلستان کے ایک قانون داں مدبر لارڈ ریڈنگ کو وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجا گیا ہے۔

۲ - جدید تعلیم و تمدن

گزشتہ ایک صدی میں انگریزوں کی حکومت سے اہل ہند کے افکار و اخلاق اور تمدن و معاشرت میں بڑا انقلاب ہوگیا ہے۔ اس پر مفصل و جامع بحث کرنیکے لئے مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ تاہم ہندوستان کی تاریخ میں اس انقلاب کے اہم اسباب اور نمایاں اثرات پر ایک اجمالی نظر ڈالنی ضرور ہے اور ان اسباب میں اہل ہند کے اندرونی تغیر کا سب سے قوی سبب جدید یا مغربی تعلیم کو سمجھنا چاہئے۔

انگریزی تعلیم کی ابتداء — ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور حکومت میں انگریزی حکام کو اپنی

ہندی رعایا کی تعلیم پر کوئی توجہ نہ تھی خاص کر انگریزی تعلیم کی اشاعت کو تو وہ مصلحت کے بالکل خلاف اور لوگوں کے مذہبی اشتعال کا موجب جانتے تھے۔ چنانچہ عیسائی پادریوں نے بطور خود انگریزی زبان اور عیسائی مذہب کی تعلیم کے مدرسے جاری کیئے تو انکی بھی کمپنی کی طرف سے اوّل اوّل مخالفت کی گئی اور پادریوں کا پہلا کالج سیرامپور میں قائم ہوا جہاں اس وقت ڈنمارک والوں کا عمل دخل تھا۔

سنہ ۱۸۱۳ء (سنہ ۱۲۲۷ھ) میں سرکاری طور پر ایک لاکھ روپیہ سالانہ "اہل ہند میں علوم کی احیا اور ترقی" کے واسطے دیا جانا منظور کیا گیا تھا لیکن یہ رقم تمام و کمال مشرقی علوم (بالخصوص مذہبی قوانین کی تعلیم) یا دیسی زبانوں کی سرپرستی میں صرف ہوتی رہی حتیٰ کہ ولیم بن ٹنگ کے عہد حکومت میں (لارڈ) مکالے "مجلس نظارت تعلیم" کا صدر نشین ہوا اور اس نے مشرقی تعلیم یا تصانیف پر سرکاری روپیہ خرچ کرنے کی سخت مخالفت کی۔ انگریزی تعلیم کی تاریخ میں مکالے کی وہ "یادداشت" مشہور ہے جس میں اس نے عربی و سنسکرت علوم اور دیسی زبانوں کی کتابوں کا خاکہ اڑایا ہے لیکن مکالے کو اپنے مقصد میں جو کامیابی ہوئی اس کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ اسی زمانے میں پارلیمنٹ نے ہندوستان میں انگریزی قوانین نافذ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مشرقی علوم کی تحصیل پر اب تک جو کچھ زور دیا جاتا تھا اس کی بنا یہی تھی کہ اس وقت تک کمپنی کی عام دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں قدیم دستور کے مطابق اسلامی فقہ اور ہندو شاستروں کی رو سے مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا، اور ان مذہبی آئین کی تعلیم و واقفیت کے لیئے عربی اور سنسکرت کا پڑھنا لازمی تھا۔ مگر جب انگریزی قوانین جاری ہوئے اور فقہ و شاستر کی ضرورت بہت کم رہ گئی تو عربی و سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کرنا بھی چنداں ضروری نہ رہا۔ غرض مکالے کی کوشش کارگر ہوئی اور اگرچہ علوم مشرقی کے دو سرکاری مدرسے جو پہلے سے قائم تھے آئندہ بھی جاری رہے لیکن گورنر جنرل کی کونسل نے اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ آئندہ سرکار کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کی اشاعت کا کام اپنے ذمے لینا چاہیئے۔ پھر بنگال، مدراس اور بمبئی میں اعلیٰ تعلیم کے لئے اسکول اور کالج جاری کیئے گئے اور شمالی ہند کے بعض حصوں میں ابتدائی تعلیم پر بھی توجہ کی گئی اگرچہ عام طور پر انگریز حکام اس کی وسیع

ذمہ داری سے لینے سے ہچکچاتے تھے۔

"ووڈ کا تعلیمی مراسلہ"

کونسل کے مذکورۂ بالا فیصلے کے بعد بھی کئی سال تک تعلیم کی رفتار بہت سست رہی، چنانچہ سنہ ۱۸۵۳ء (۱۲۶۸ھ) تک کل چودہ سرکاری اسکول اور کالج جاری ہوئے جن میں طالبعلموں کا شمار چالیس ہزار سے بھی کم تھا[53] بایں ہمہ پادریوں کی کوشش اور سرکاری ملازمت ملنے میں آسانی کی وجہ سے اوّل تو اہلِ ہند میں انگریزی سیکھنے کا شوق روز افزوں ترقی کر رہا تھا، دوسرے خود انگریز حکّام کو بھی انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں سے انتظامی کاموں میں مدد ملنے لگی تھی۔ یہ اور بعض دیگر وجوہ سے آخر سرکار کو انگریزی تعلیم کی مزید اشاعت و ترویج پر آمادہ کر دیا اور اس مرتبہ خود نظمائے کمپنی کی جانب سے ایک مبسوط تحریری تجویز، گورنر جنرل کے نام بھیجی گئی جو "ووڈ[54] کے تعلیمی مراسلے سنہ ۱۸۵۴ء" کے نام سے مشہور ہے۔

اس مراسلے میں ہدایت کی گئی تھی کہ آئندہ ہندوستان کے ہر احاطے میں ایک علیحدہ محکمۂ تعلیمات قائم کیا جائے اور ان کے صدر مقامات پر ایک یونیورسٹی بنا دی جائے۔ موجود الوقت انگریزی اسکول اور کالجوں کی تعداد میں حسب حد تک مناسب ہو اضافہ کیا جائے اور تحتانی یا ابتدائی مدارس کی اس طریق پر اصلاح اور نگرانی کی جائے کہ اُن کے تعلیم یافتہ طلبہ بہ آسانی فوقانی مدارس میں داخل ہو سکیں۔ ان اعلیٰ مدارس میں ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان کو قرار دیا گیا اور ادنیٰ مدارس میں بھی "جہاں مانگ ہو" انگریزی سکھانے کا انتظام کرنے کی سفارش کی گئی۔ مراسلے میں ایسے خانگی مدارس کو امداد دینے کی بھی تحریک تھی جو اپنے نصاب تعلیم اور عام تعلیمی مضمول میں سرکار کی نگرانی اور مشورہ قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔

عہد کی تاریخ

مذکورۂ بالا تجاویز کے مطابق سنہ ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں یونیورسٹیاں قائم کر دی گئیں لیکن ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ء اور بعد میں بعض مالی مشکلات کی وجہ سے

---

[53] گروسے ئیر۔ جلد چہارم صفحہ ۴۱۲

[54] سر چارلس ووڈ جو بعد میں لارڈ ہیلی فیکس کے خطاب سے مشہور ہوئے اس زمانے میں نظمائے کمپنی کی مجلس نظارت کے میر مجلس تھے۔ مذکورۂ بالا تعلیمی مراسلہ، نیز میکالے کی یادداشت حال ہی میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ از سرِ نو شائع کر دی گئی ہے (دیکھو رپورٹ جلد چہارم ضمیمہ دوم و سوم)

وجہ سے کئی سال تک انگریزی تعلیم زیادہ ترقی نہ کرسکی البتہ ۱۸۵۸ء سے اس کی رفتار میں نمایاں تیزی نظر آتی ہے یعنی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اعلیٰ تعلیم کے کالج کھل رہے ہیں اور بہ مشکل کوئی بارونق قصبہ یا تحصیل کا مقام ایسا ہوگا جہاں انگریزی تعلیم کے وسطانی (مڈل) یا فوقانی (ہائی اسکول) مدرسے جاری نہ ہو گئے ہوں۔ ابتدائی تعلیم کو بڑی ترقی اس وقت ہوئی جب کہ اس کا انتظام مقامی بلدیات کے حوالے کیا گیا اور ان بلدیات کو تعلیمی مصارف کے واسطے "چنگی" کا محصول وصول کرنے کی اجازت مل گئی۔

۱۸۸۰ء (۱۲۹۶ھ) میں انگریزی کالجوں کی تعداد ساٹھ سے زیادہ اور ان میں تعلیم پانے والے تقریباً ۶ ہزار تھے۔ پھر جب اسی زمانے میں ایک علیحدہ پنجاب یونیورسٹی (۱۸۸۲ء) اور الہ آباد یونیورسٹی (۱۸۸۷ء) قائم ہوئی تو شمالی ہند میں اعلیٰ تعلیم کی ترویج میں اور بھی آسانیاں ہوگئیں۔ دوسرے یہی زمانہ ہے جب میں مسلمانوں نے مغربی علوم سیکھنے پر توجہ کی۔ مذہبی تعصبات کی بناء پر وہ اب تک انگریزی مدرسوں میں داخل ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ ۱۸۳۶ء (۱۲۵۱ھ) میں حاجی محمد محسن کے مذہبی وقف سے ہگلی میں ایک انگریزی کالج قائم کیا گیا تھا لیکن ۱۸۵۰ء تک کل چار سو طلبہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف پانچ تھی![1]

مسلمانوں کے تعصبات دور کرنے کی سرکار انگریزی (خاص کر لارڈ میئو) نے بھی کوشش کی اور اس میں ڈاکٹر سر سید احمد خاں بانی مدرسۃ العلوم (بنا ۱۸۷۵ء) علی گڑھ کی کوششوں سے بہت کچھ کامیابی ہوئی کہ رفتہ رفتہ شمالی ہند کے مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوگئے۔ بایں ہمہ سرکار کی خاص مراعات اور بعض لوگوں کی ذاتی کوششوں کے باوجود ابھی تک وہ اس میدان میں اپنے ہندو ہم وطنوں سے پیچھے ہیں۔

[1] رپورٹ کلکتہ کمیشن جلد چہارم صفحہ ۷۶۔ اس جگہ یہ صراحت کردینی مناسب ہوگی کہ حاجی محمد محسن کا خاندان ایران سے آکر بنگالے (ہگلی) میں آباد ہوگیا تھا۔ وہ نہایت دولتمند تاجر تھے اور انھوں نے وفات سے کچھ پہلے اپنی تمام جائداد مذہبی کاموں کے لیے وقف کردی تھی (سنہ ۱۲۲۱ھ) لیکن چند سال کے بعد متولیوں کی بدنظمی اور خیانت کی شکایت پر سرکار انگریزی نے اس جائداد کو جس کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ کے قریب تھی اپنی تحویل میں لے لیا اور بہت دن تک یہ روپیہ عام تعلیمی اغراض میں صرف ہوتا رہا لیکن اب زیادہ تر غریب مسلمانوں کے تعلیمی وظائف اور مدارس کی امداد کے کام میں آتا ہے۔

نیچ کے دنوں میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں نے جس بلند آہنگی سے اپنے سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا، اس نے بہت سے انگریز حکام کو اس طریق تعلیم سے بدگمان کر دیا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ابتدا میں انگریزی تعلیم کو رواج دینے کی بڑی غرض یہی تھی کہ سرکار کو انگریزی داں ہندوستانی ملازمین ملنے میں سہولت ہو لیکن انگریزی مدارس اور طلبہ میں جس تیزی سے اضافہ ہوا تھا اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ صدہا نئے تعلیم یافتہ ملازمت سے محروم رہنے لگے لہٰذا اگر اُن کے ایک گروہ نے "سیاسی شورش" کو اپنا مشغلہ بنا لیا تو ہمیں کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ مگر انگریزی تعلیم کے اس رواج عام کو روکنے کی اگر سرکاری طرف سے کوئی کوشش کی بھی گئی تو وہ چنداں کامیاب نہ ہوئی اور مجموعی طور پر سرکاری مدارس اور تعلیمی مصارف میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ خانگی اور ابتدائی مدارس کو چھوڑ کر، آج کل (انگریزی علاقے میں) صرف سرکاری کالجوں اور ثانوی مدارس کی تعداد ۸ ہزار کے قریب ہے جس میں تقریباً بارہ لاکھ ہندوستانی طلبہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ڈھاکہ، پٹنہ وغیرہ مقامات میں نئی یونیورسٹیاں کھل رہی ہیں۔ اور ہندو اور مسلمانوں نے مخصوص تعلیمی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر بنارس اور علی گڑھ میں اپنی اپنی یونیورسٹیاں علحدہ بنائی ہیں۔ مگر مغربی علوم کی تاریخ میں سب سے دلچسپ اور جدید تجربہ وہ ہے جس نے ریاست حیدرآباد میں جامعۂ عثمانیہ کی صورت اختیار کی۔ اور سرکار نظام خلداللہ ملکہٗ نے قرار دیا کہ اس یونیورسٹی میں علوم مغربی کی اعلیٰ تعلیم "ہندوستانی" زبان کے ذریعے دی جائے۔

مطابع اور السنۂ ہند

مغربی علوم کی تشویق و ترویج میں سرکاری مدارس اور پادریوں کی کوشش کے علاوہ، سب سے زیادہ مدد جدید مطابع اور دیسی زبانوں کی نئی کتابوں اور اخبارات سے ملی۔ نئی قسم کے چھاپے خانے کو سب سے اول پادری ہندوستان لائے تھے پھر اٹھارویں صدی میں سرکاری ضرورتوں کے واسطے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں انگریزی مطابع قائم ہوئے۔ لیکن سب سے پہلا (غیر سرکاری) اخبار جو ہندوستان میں (کلکتہ سے) جاری ہوا "بنگال گزٹ" تھا (۱۷۸۰ء سنہ ۱۱۹۴ھ) اس انگریزی اخبار کے اڈیٹر مسٹر ہکی کو وارن ہیسٹنگز کی بیوی کے خلاف مضامین لکھنے کی سزا میں کئی سال کی قید ہوئی اور اس کے جانشین "انڈین گزٹ" کے اڈیٹر کا بھی اسی قسم کا حشر ہوا۔ ان نو خیز اخبار والوں کی دریدہ دہنی سے

لارڈ ولزلی کے عہد میں اخبارات کی آزادی پر سخت قیود عائد کردی گئی تھیں مگر سر چارلس مٹکاف کے زمانے (۱۸۳۵ء — سنہ ۱۲۵۱ھ) میں ان قیود کو فی الجملہ ختم کردیا گیا۔

دیسی زبانوں کے ابھرنے اور تحریری زبان بننے کا بھی زمانہ یہی ہے اور کم سے کم نثر اردو کا تو بانی مبانی انگریزوں کو سمجھنا چاہیئے۔ اردو زبان کی سب سے پہلی کتابیں (آرائش محفل، باغ و بہار وغیرہ) انہی کی سرپرستی میں کلکتے سے شائع ہوئیں اور آہستہ آہستہ فارسی کے بجائے ہندوستانی نیز دوسری دیسی زبانیں "سرکاری زبان" قرار دی جانے لگیں۔ دیسی زبان (بنگالی) کا پہلا اخبار "سماچار درپن" سیرامپور سے مسیحی پادریوں نے ۱۸۱۸ء میں جاری کیا۔ مگر سیسے کے حروف سے اردو تحریر کی کتابیں چھاپنے میں بہت خرچ ہوتا تھا لہٰذا اس زبان کے نئے جرائد و کتب کی ترقی کا زمانہ ۱۸۳۲ء (۱۲۴۷ھ) سے شروع ہوتا ہے جب کہ دہلی میں لیتھو پتھر کا پہلا مطبع قائم ہوا اور تھوڑے دن بعد غالباً وہیں سے اردو زبان کا پہلا اخبار نکلا۔[1]

۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن نے "دیسی اخبارات" کی آزادی روکنے کے لیے بہت سی قیود بڑھا دیں۔ مگر لارڈ رپن نے انہیں منسوخ کردیا۔ اور پھر اس قسم کے قوانین ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۰ء میں نافذ ہوئے جن سے اخبارات کی آزادی روکنے کے معاملے میں انتظامی عہدہ داروں کے اختیارات بہت بڑھ گئے اور انہیں اس بات کی اجازت مل گئی کہ بغیر عدالتی مقدمہ کئے، وہ مشتبہ مطابع کو ضبط اور اخبارات کو بند کرسکتے ہیں۔ یہ "قوانین مطابع" عام تھے مگر ان کی زد میں زیادہ تر دیسی مطابع اور ہندوستانیوں ہی کے جرائد آئے۔ حال میں (۱۹۲۱ء) سرکار کی طرف سے اہل الرائے کی ایک جماعت ان قوانین پر غور کرنے کے واسطے متعین ہوئی تھی اور اسی کی سفارش سے مذکورۂ بالا قیود کو ایک حد تک دور کردیا گیا ہے۔

---

[1] حال میں دیسی جرائد کی تعداد میں بڑی ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ "جنگ یورپ" سے پہلے اخبارات و رسائل کی کل تعداد جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے شائع ہوتے تھے ڈیڑھ ہزار سے بھی زیادہ تھی۔

انقلاب کے دیگر اسباب

مغربی علوم کی اشاعت کی طرح۔ انگریزوں کے ساتھ میل جول اور مغربی تمدن کی ترویج نے اہل ہند کی معاشرت میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کردیں۔ کنکر یا روڑے کی کچی سڑکیں تو لارڈ ہیسٹنگز اور ایمہرسٹ ہی کے زمانے میں بننے لگی تھیں مگر ڈلہوزی کے عہد میں ریلوں کا آغاز ہوا اور آئندہ پچاس برس میں ان کا ہزاروں میل کا جال تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔ سیاحت و سفر کی آسانیوں کے ساتھ ان ریلوں کے ذریعے بیرونی تجارت کو نہایت فروغ ہوا اور یورپ کی مصنوعات ہندوستان کے گوشے گوشے میں ارزاں قیمت پر فروخت ہونے لگیں۔ تجارت درآمد کی حیرت انگیز ترقی کا سرسری اندازہ اس واقعے سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ سنہ ۱۸۴۳ء میں اشیاء درآمد کی قیمت کا سالانہ اوسط پانچ کرور روپے سے کم تھا۔ مگر اب (جنگ یورپ سے پہلے یعنی سنہ ۱۹۱۴ء میں) سوا دو ارب روپے کے قریب پہنچ گیا ہے[۱]!

سنہ ۱۸۶۹ء کے اواخر (سنہ ۱۲۸۶ھ) میں خلیفہ ہارون الرشید کا خواب، حیز عمل میں آگیا ہے یعنی نہر سویز کی تیاری نے یورپ و ایشیا کے سمندروں کو ملا دیا[۲] اور انگلستان سے ہندوستان تک جہازی سفر صرف اتنے دن کا رہ گیا جتنے دن میں پہلے دہلی سے برہانپور یا اورنگ آباد پہنچا کرتے تھے! ادھر تار برقی اور بحری تار کے ذریعے ممالک بعیدہ سے گھنٹوں میں ایک دوسرے کی خبریں ملنے لگیں! اور سیاحت و سفر کی ان انقلاب انگیز سہولتوں نے مشرق و مغرب میں آمد و رفت کا راستہ کشادہ کردیا۔ ہندوستان سے صدہا آدمی تعلیم و تجارت یا سیر و سیاحت کی غرض سے یورپ و امریکہ جانے اور وہاں کے آداب معاشرت اپنے ساتھ ہندوستان لانے لگے۔ یوں بھی حکمراں اور دولتمند قوم کی ہر ادا میں دلکشی ہوتی ہے اور ہندوستان کے قدیم رسوم و تمدن کو توجہل، افلاس نے اور بھی بدنما کر رکھا تھا۔ غرض ان اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ لباس اور طعام و مکان اور سواری نشست و برخاست، رفتار و گفتار، غرض ہر بات میں ہندوستان کے بہت سے

---

[۱] "فنانشل اینڈ کمرشل اسٹیٹسٹکس"، مطبوعہ سنہ ۱۹۰۱ء۔ نیز دیکھو "اسٹیٹسمنز ایئر بک سنہ ۱۹۱۹ء" وغیرہ

[۲] اس تجویز کی گذشتہ تاریخ کے متعلق دیکھو "انسائکلو، برٹ" جلد بست و ششم۔

لوگ خاص کر نئے تعلیم یافتہ، اہل یورپ کی تقلید کرنے لگے۔

افکار و اخلاق

مگر طرز معاشرت کے ان تغیرات کے علاوہ ہندوستان والوں پر اہل یورپ کے خیالات کا بہت گہرا اثر ہوا جس وقت انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس وقت عام اہل ہند کی علمی اور اخلاقی حالت نہایت ابتر تھی۔ بے شبہ دہلی، لکھنو، خیرآباد، جون پور وغیرہ بعض مقامات میں تیرہویں صدی ہجری (انیسویں عیسوی) تک بعض متبحر اسلامی علماء موجود تھے جن کے علم و فضل صلاح و تقوی اور حکیمانہ تصانیف کی آج تک اسلامی دنیا میں گونج ہے لیکن اس زمانے میں ان بزرگوں کی تعلیم کا اثر بہت محدود ہوگیا تھا۔ عوام الناس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ طبقۂ اعلیٰ کے افراد کو بھی اپنے لغو مشاغل میں تحصیل علوم کی فرصت نہ ہوتی تھی۔ دوسرے اس بات کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ انگریزی تعلیم کو سب سے پہلے اُن لوگوں نے اپنی اولاد میں پھیلایا جو بالعموم مشرقی علوم سے بے خبر یا سطحی واقفیت رکھتے تھے۔ ورنہ کم سے کم مسلمان علماء اور جو لوگ ان کے اثر میں تھے، وہ عرصہ دراز تک اپنی اولاد کو انگریزی زبان سکھانے سے اجتناب کرتے رہے۔

بہر حال، جب ایک گروہ کثیر مغربی علوم سے آگاہ ہوا تو اہل یورپ کی تصانیف نئے خیالات، نئے انکشافات اور نئے طرز بیان میں جو دلفریبی ہے اُس نے بہتوں کو اپنا گرویدہ بنالیا اور جدید خیالات کے مقابلے میں قدیم فلسفہ اور ادب تقویم پارینہ نظر آنے لگے۔ نظم و نثر تحریر و تقریر اور ہر قسم کے علم و فن کے معاملات میں یورپ کی پیروی کی جانے لگی۔ اور جہاں یہ اثرات زیادہ پھیلے تھے وہاں لوگوں کے مذہبی عقائد اور اخلاق میں بھی نمایاں تغیر ہوگیا جو موجودہ زمانے کے ارباب بصیرت کے سامنے ہے۔

۳۔ آئین و اصول حکومت

لیکن کم و بیش ایک صدی کی انگریزی حکومت نے سب سے اہم انقلاب اہل ہند کے سیاسی خیالات میں پیدا کیا۔ دور قدیم سے قطع نظر جس کے سیاسی آئین کی کوئی واضح اور معتبر تاریخ موجود نہیں، ہندوستان میں سلاطین دہلی و مغل کی سلطنت

سلاطین دہلی کی حکومت کی نوعیت گویا ایک جنگجو اور اولوالعزم سپاہی کی تھی۔ اس میں جو خوبیاں اور عیب ہو سکتے ہیں تقریب تقریب وہ سب مسلمانوں کے آئین حکومت میں نمایاں ہیں جیسا کہ ہم اس کتاب کے پہلے حصوں میں جا بہ جا اشارہ کرچکے ہیں، مسلمانوں کی ابتدائی سلطنت جمہوریت کے عناصر سے خالی نہ تھی لیکن اس کا زیادہ تر رجحان شخصی بادشاہی کی طرف تھا۔ بالآخر میں سلاطین تیموریہ نے اسی شخصی طرز بادشاہی کو نہایت استحکام کے ساتھ ہندوستان میں قائم کیا۔ ان مغل بادشاہوں کے اعلیٰ اوصاف شاہانہ سے انکار نہیں اور اقتصادی اعتبار سے ان کے عہد حکومت میں ہندوستان نہایت دولتمند وخوش حال رہا لیکن اسی کے ساتھ عام رعایا اپنے ملکی معاملات سے بالکل بے خبر اور سیاسی حقوق سے مطلقاً محروم ہوگئی۔ لوگوں کی شخصی اور مذہبی آزادی میں کوئی خاص مداخلت نہ کی جاتی تھی۔ وضع قوانین اور اپنے مقدمات کے فیصل کرنے کا بہت کچھ دیہات کی پنچائتوں کو اختیار تھا۔ بایں ہمہ ملکی معاملات میں بادشاہ کی انفرادی رائے قول فیصل کا حکم رکھتی تھی اور اس کے احکام کے خلاف کسی کو نکتہ چینی کی مجال نہ تھی۔

ان آئینوں کے مقابلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت گویا تاجروں کی بادشاہی تھی، اور اس میں تمام وہ محاسن و معائب موجود تھے جو کسی تجارتی کارخانے کی خصوصیات ہیں۔ کمپنی کے کارکنوں نے اول اول اہل ہند سے ملک و مال لینے میں، یا اپنے تجارتی فوائد کے لیئے ہندوستانی مصنوعات اور تجارت کو نقصان پہنچانے میں جو جو زیادتیاں کی ہیں، ان کی تفصیل پڑھنی ہو تو ولیم ڈگبی، دادابھائی نوروجی، مسٹر دت وغیرہ مشہور مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جن میں بڑی عرق ریزی سے مذکورہ بالا "زرکشی"، اور ہندوستان کے روزافزوں افلاس کی شہادتیں، خود سرکاری بیانات اور مسلمہ واقعات سے مہیا کی گئی ہیں لیکن یہاں خاص طور پر جو بات جتانی منظور ہے وہ یہ ہے کہ کمپنی کے عہدہ دار اہل ہند کے حق میں کیسے ہی استبداد پسند ہوں، خود ان کا نظام حکومت "اشتراکی"، اور اس لیئے ایک حد تک جمہوری تھا اور وہ ملکر کام کرنے کے اصول اور خوبیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ دوسرے اٹھارویں صدی عیسوی (بارھویں ہجری) میں اہل یورپ کے سیاسی خیالات

میں جو بہ دست انقلاب پیدا ہوا اس کے اثر سے ہندوستان ... نئے حکمران مستثنیٰ نہ تھے اور اپنی اغراض کی وجہ سے وہ اہل ہند کی آزادی ... کیسے ہی مخالف کیوں نہ ہوں۔ عام لوگوں کے سیاسی حقوق کا یقیناً گذشتہ بادشاہوں اور اُن کے اُمرا سے زیادہ احساس رکھتے تھے۔

انگریزی فتوحات کی نوعیت

ایک اور اہم سبب جس کا آئینِ حکومت پر اثر پڑنا ناگزیر تھا، یہ ہے کہ انگریزوں کا ممالک ہند پر تصرف و تسلط عام فتوحات سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ تاریخ کے مشہور فاضل پروفیسر سیلی نے اپنی معرکہ آرا کتاب "دی ایکس پین شن اوف انگلینڈ" میں نہایت محققانہ بحث کے بعد بتایا ہے کہ انگریزی قبضۂ ہند کو "فتح" سے تعبیر کرنا درست نہیں، درحقیقت اسے خود اہل ہند کے ایک اندرونی ملکی انقلاب کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ یا کہنا چاہیئے کہ ہند کو خود اہل ہند نے (انگریزوں کیلئے) فتح کیا کیونکہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگلستان سے کوئی بڑی فوج ... لا کر لڑائی نہیں ... بلکہ ایک عام بدنظمی اور انتشار کے زمانے میں جب کہ کہیں کوئی ... اور کہیں کوئی فوجی سردار محض اپنی ذاتی سعی اور شخصی اغراض کے لیئے حکومت و ریاست حاصل کرنے کی تگ و دو کر رہا تھا، پہلے فرانسیسی اور پھر انگریز تاجر بھی اس دوڑ میں شریک ہو گئے اور کسی باجی راؤ یا کسی حیدر علی کی طرح انھوں نے بھی یہیں کے اجیر سپاہیوں کی مدد سے اپنے ملکی مقاصد میں کامیابی حاصل کر لی بلکہ کمپنی کا ان افراد کے مقابلے میں ایسی کامیابی حاصل کر لینا کچھ تعجب انگیز نہیں کیونکہ وہ کم سے کم ایک متحد جماعت تھی اور بوقت ضرورت اپنے ملک (انگلستان) سے بھی کچھ نہ کچھ امداد حاصل کر لیتی تھی[1]۔ الغرض اگرچہ ہندوستان کے اندرونی خلفشار اور حکمران طبقے کی نااہلی سے کمپنی نے فائدہ اٹھایا لیکن اس کو جو کامیابی ہوئی وہ بہت کچھ اہل ہند ہی کی مدد سے ہوئی تھی اور بعد میں جس قدر نظم و نسق کا کام بڑھتا گیا اسی قدر کمپنی کے ہندوستانی ملازمین کی تعداد میں اضافہ ہوا

[1] سیلی کی محولہ کتاب کے حصۂ دوم میں زیادہ تر "ہندوستان" ہی کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے اور ... کر دوسرا اور تیسرا باب "دیا ... و رس" پڑھنے کے لائق ہے۔ مذکورہ بالا اقوال و آرا کیلئے دیکھو صفحات ۲۰۸ تا ۲۱۱ و ۲۲۸ و ۲۴۷ وغیرہ وغیرہ۔

پھر جب یہ ملازمین اپنی قابلیت اور سرکار انگریزی کی خیر خواہی کے صلے میں "سول سروس" اور انگریزی عدالتوں کے ممتاز عہدوں تک ترقی کرنے لگے تو عام ہندوستانی رعایا کی مجموعی قدر و منزلت بھی انگریزی حکام کی نظر میں پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ۔

ابتدائی مجالس وضع قوانین

ایک مدت تک سب سے اعلیٰ انتظامی یا فوجی عہدوں تک اہل ہند کی رسائی نہ تھی اور نہ وہ حکومت عالیہ (سپریم گورنمنٹ) کی ان مجلسوں میں شریک کیئے جاتے تھے جو وائسرائے کو ملکی انتظام یا وضع قوانین کے کام میں امداد و مشورہ دینے کے واسطے بنائی گئی تھیں ۔ اس طرح اگرچہ مغربی آئین سے واقفیت اور انگریزی تعلیم کے اثر سے اہل ہند میں اپنے سیاسی حقوق کا احساس پیدا ہو چلا تھا اور ۱۸۶۱ء (۱۲۷۷ھ) کے قانون "مجالس ہند" کے نفاذ کے وقت ہی یہ ضرورت تسلیم کر لی گئی تھی کہ ہندوستان کے لیئے جو قوانین وضع کیئے جائیں ان میں کسی حد تک اہل ہند سے مشورہ کرنا مفید ہوگا ۔ لیکن اوّل تو ان ابتدائی مجالس کے ارکین کی تعداد اور اختیارات بہت غیر وقیع تھے ۔ اور ۱۸۹۲ء (۱۳۰۹ھ) کے دوسرے قانون کے اجرا تک خود وائسرائے ان ارکین کو نامزد کر دیا تھا ۔ دوسرے ۹۲ء میں جب ارکین کی تعداد میں اضافہ اور نیز محدود طریقے پر "انتخاب" کا عنصر داخل ہوا تو اس وقت بھی اس مجلس کو انتظامی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ملا اور حکومت کی اصلی باگ وائسرائے اور اس کی مجلس انتظامی ہی کے ہاتھ میں رہی جس کے سات آٹھ ارکین میں ۱۹۰۹ء (۱۳۲۷ھ) تک کوئی ہندوستانی آدمی نہ تھا[1]۔

حکومت ہند کی محکومانہ حیثیت

مگر حکومت ہندوستان کے ان آئین و اختیارات کا حال پڑھتے وقت ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان کی یہ انگریزی حکومت بجائے خود آزاد و خود مختار حکومت نہیں بلکہ حکومت انگلستان کی ماتحت ہے ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد اقتدار میں پارلیمنٹ جس طرح وقتاً فوقتاً ہندوستان کے معاملات میں دخل دیتی رہی اس کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں ۔ یہ دخل رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا کہ ۵۷ء کی شورش کے

---

[1] مذکورہ بالا حالات اکثر انگریزی تاریخوں میں جستہ جستہ منقول ہیں لیکن ہمارا خاص ماخذ مسٹر مون ٹیگو کی "رپورٹ آن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ریفارمز" مطبوعہ ۱۹۱۸ء ہے جس کے ابتدائی ابواب میں حکومت ہندوستان کے ابتدائی آئین پر بحث کی گئی ہے ۔ نیز دیکھو گزیٹیر جلد چہارم باب پنجم

بعد کمپنی کا اقتدار بالکل اُٹھ گیا اور اس وقت سے ہندوستان براہ راست انگلستان کی پارلیمنٹ کا محکوم بن گیا۔ پارلیمنٹ کے سامنے وزیر ہند ہندوستان کے انتظام کا ذمہ دار ہے اور یہاں کے بڑے بڑے عہدہ داروں کا انتخاب و تقرر، نئے آئینی قوانین کی منظوری اور تمام اہم معاملات کا فیصلہ یہی پارلیمنٹ یا انگلستان کی حکومت کرتی ہے۔ بے شبہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کے پیچیدہ اور جزوی معاملات میں مقامی حکام کو کافی اختیار دینا ناگزیر ہے اور انہی اختیارات میں اہلِ ہند کو شریک کرنے کی غرض سے لارڈ مورلے نے اپنی وزارتِ ہند کے زمانے میں وہ آئینی اصلاحات نافذ کیں جو "منٹو مورلے اصلاحات سنہ ۱۹۰۹ء" (سنہ ۱۳۲۷ھ) کے نام سے مشہور ہیں یعنی مجالس وضع قوانین کے ہندوستانی اراکین کی تعداد اور حقوق میں اضافہ کیا گیا اور وائسرائے اور گورنروں کی انتظامی مجالس میں بھی ایک ایک ہندوستانی کو شریک کر لیا گیا، بایں ہمہ ان مراعات سے اہلِ ہند کی تشفی نہیں ہوئی اور وہ ان سے کہیں زیادہ حقوق و اختیارات کا مطالبہ کرتے رہے۔

اہلِ ہند کے مطالبات اور نئی اصلاحات۔

ان مطالبات میں بلند آہنگی تو تقسیم بنگالہ (سنہ ۱۹۱۱ء) کی شورش کے زمانے سے پیدا ہوئی تھی لیکن بعد میں دیگر اسباب سے مزید تقویت پہنچی۔ یعنی اوّل تو مسلمان جو بہت دن تک کانگرس سے علیحدہ بلکہ اس کے مخالف رہے تھے، رفتہ رفتہ اس مطالبے میں کانگرس کے ہم آواز ہو گئے کہ ہندوستان کو اسی قسم کی حکومت خود اختیاری ملنی چاہیئے جیسی کہ انگلستان کی "نوآبادیوں" کو کناڈا، آسٹریلیا وغیرہ ممالک میں حاصل ہے۔ دوسرے جنگِ یورپ میں برطانیہ کے مدبروں نے جنگ کے جو مقاصد اور آئندہ اصلاحات کے متعلق جس قسم کے ارادے ظاہر کئے تھے اُن سے سیاسی آزادی کا جوش بہت بڑھ گیا اور اہلِ ہند ممالک مغربی کے طرز پر اپنے ملک میں بھی ایک ایسی جمہوری حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگے جس کے اندرونی معاملات میں انگریزوں کا کوئی دخل نہ ہو۔

خود حکومت برطانیہ کی طرف سے بھی دورانِ جنگ میں سیاسی مراعات کا وعدہ کیا گیا تھا، اور سنہ ۱۹۱۹ء میں اس کا ایفا ہوا یعنی وزیر ہند مسٹر مونٹیگو کی تجاویز کے مطابق ہندوستان کی قانونی اور انتظامی مجالسِ عالیہ (سپریم کونسلز) میں

ہندوستانیوں کی تعداد بڑھادی گئی۔ صوبوں کی مقامی مجلسوں میں وضع قوانین کا بہت کچھ کام اہل ہند کے انتخاب کردہ ارا کین کے حوالے کردیا گیا۔ بعض مقامی محکمے، جیسے تعلیمات حفظانِ صحت وغیرہ، انہی منتخب شدہ ارا کین کے افراد کے تفویض ہوئے اور انھیں (صوبے کے) وزیر (منسٹر) کا نیا خطاب ملا۔ بلکہ بنگالے کے ایک صاحب (لارڈ سنہا) کو اوّل مرتبہ "لارڈ" کا خطاب دیکر گورنری کے ممتاز عہدے پر مقرر کیا گیا جو یقیناً اہل ہند کی عزت افزائی ہے۔ بایں ہمہ ہندوستان کے اکثر سیاسی سرگروہوں کی ان مراعات سے بھی سیری نہیں ہوئی اور اُن کے مطالبات آج تک برابر بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ موجودہ سیاسی بے اطمینانی کا ایک سبب تو اُن اشتعال انگیز واقعات کو سمجھنا چاہیئے جن کا اس باب کی پہلی فصل میں ہم اجمالاً ذکر کرچکے ہیں لیکن ایک اور تہ کا سبب وہی حکومت برطانیہ کا دخل و اقتدار ہے جس میں مذکورۂ بالا سیاسی مراعات و اصلاحات سے بھی کوئی خاص کمی نہیں آئی ہے۔ بے شبہ مسٹر مان ٹیگو نے اپنی تجاویز میں آئندہ طریقِ عمل کے جو چار بنیادی اصول قائم کیئے ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس نسبت سے اہل ہند کے سیاسی حقوق میں توسیع کی جائے اسی نسبت سے حکومت ہند کے معاملات میں پارلیمنٹ اور وزیر ہند کے دخل و نگرانی کو کم کردینا ضروری ہوگا۔[1] تاہم جیسا کہ ان تجاویز کے شائع ہونے سے ایک سال پہلے ونسنٹ اسمتھ نے جتایا تھا،[2] درحقیقت گذشتہ پچیس تیس برس میں پارلیمنٹ اور وزیر ہند کی مداخلت برابر بڑھتی رہی ہے اور نہ صرف ہندوستان کے نئے آئین و قوانین کی منظوری بلکہ تمام اہم ملکی معاملات کا آخری فیصلہ دہلی اور شملے کے بجائے انگلستان کے "ایوانِ سفید" میں ہوتا ہے۔ اور اس کا سبب ظاہر ہے کہ اکبر و عالمگیر کو بعید صوبوں کے انتظام میں نہ یہ آسانیاں حاصل تھیں اور نہ تمام حالات کی اسقدر جلد اور مفصل خبریں مل سکتی تھیں جسقدر کہ اب تار برقی اور اخبارات کے ذریعے وزیر ہند کو لندن میں رہ کر حاصل ہوجاتی ہیں!

---

[1] "رپورٹ ...... ریفارمز" صفحہ ۱۲۵

[2] اوکسفرڈ ہسٹری صفحہ ۷۷۹

تمت

غلط نامہ

تاریخ ہند کتاب چہارم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۱	۹	مقام ہر پٹنے میں	مقام پر	۳۶	۹	۲۳ شنبہ	۱۷۲۶ء
۲	۱۵	قرائس	قرائن	۳۷	۱۱	دسویں صدی	اس نقد و [illegible]
۴	۷	کرلی جو	کرلی۔ اور یہ				صدی یا پڑھتا [illegible]
۶	۳	اور [illegible]	[illegible]	۳۹	۱۰	توانگر بزدل	توانگر بزدل
״	״	علی دررتی	علی دردزی	״	۱۴	گرودم دل	گردم دل
۱۱	آخری	چند اصاحب اصلی	چند اصاحب کا اصلی	״	۲۰	آگرے	آگرے
۱۱	۱۹	جیتی ہیں	جیتے ہیں	۴۲	۲	جس میں ولندیزوں	جہاں ولندیزوں
״	۲۰	نیمہ	نتیجہ	۴۸	۱۴	وگولکنڈے	یا گولکنڈے
۲۰	۱۶	پرانا نام	پرانا نام	۵۵	۲	او صحیح	اور صحیح
۲۷	۱۰	سادات	سادات	۵۶	۱	پڑھای جاتی	پڑھائی جاتی
۲۸	۱۳	سرہندل	سرہند کی	۵۷	۴	کہ کلکتے کی	کہ آیا کلکتے کی
״	۱۷ و ۱۸	مسلوں	مسلوں	״	۵	تھی کہ لڑائی	تھی یا لڑائی
״	۲۰	اس رو سے ستلج اس پار	اس رو سے ستلج	۵۹	۱۸	بہار کے حدود	بہار کی حدود
۲۹	۱۰ و ۱۵	ستلج اس پار	اس رو سے ستلج	۶۱	۱۴	لجانت	لجاجت
۳۵	۱۲	حصے دار	حصہ دار	۶۲	۲۲	علی الزعم	علی الرغم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۷۰	۷	وہم	وہم	۱۲۳	۱۸	آوک لینڈ	(ہر جگہ "اوک لینڈ"
۷۵	آخری	پورنیا پردو	پورنیا کے سپرد				ہے)
۸۲	۲	پھرکے ماتحت	پھرگے کے ماتحت	۱۲۴	۱۲	دُرّہ	(ہر جگہ بلاتشدید
۸۴	۱۶	گنبتور	گنتور				"درہ" ہے)
۹۲	۷	رکھتی	رکھنی	۱۲۵	حاشیہ سطر ۲	پریزیڈنٹ	ریزیڈنٹ
۹۸	۲۴	جب ن... بیلسلڈرکا	جب اِن۔ بیلسلڈرکا	۱۲۷	۱۵و۱۹	میک نارٹن	میک ناٹن
		...شکست ہوتی	...شکست ہوئی	۱۳۰	۱۶	تک دوؤمیں	تگ ودَو میں
۹۹	۲۳	کلکتے کو	کلکتے کی	۱۳۰	۸	شرفا میں۔	شرفا میں تھا۔
۱۰۴	۲۲	پہاڑی پر	پہاڑی ریاست پر	۱۳۳	۱۸	ڈلہاوزی	ڈلہاوزی یا ڈلہوزی
۱۰۵	۱۶	کا یہ تو کام	کا تو یہ کام	۱۴۷	۷	اور شہر	اور اس شہر
۱۱۳	۲۰	ہیس ٹنگز کے	ہیس ٹنگز نے	۱۵۰	۲۰	دست پرور	دست پروردہ
۱۱۴	۷	اسی مقصد	اصلی مقصد	۱۵۴	۱۰	ہر قسم کی	ہر قسم کے
״	۱۰و۱۵	رعیت داری	"رعیت واری"	۱۶۰	۲۱	بڑے تیور	بُرے تیور
۱۱۶	۸	ہمیں	یہاں	۱۶۳	۲	یہ مقام	بہ مقام
۱۱۹	۳	کارنامۂ ستی	کارنامۂ "ستی"	۱۶۹	۱۱	حفالت	حفاظت
۱۲۲	۸	وراب تک بعض	اور اب تک بعض	۱۸۴	۱۳	کردیا تہا	کردیتا تھا
		...اس کو ہجو	...اس کی ہجو	۱۸۵	۱۹	جسم قسم	جس قسم

تمت

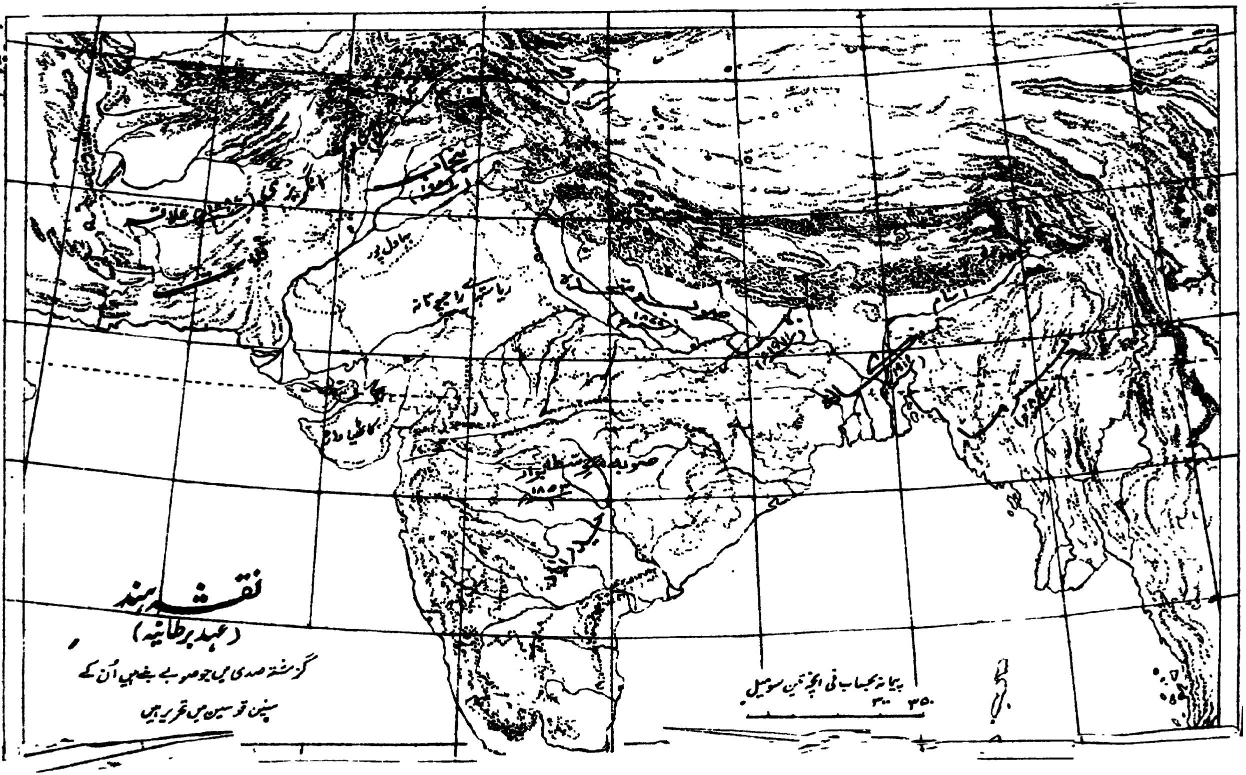

نقشہ ہند
(عہد برطانیہ)
گزشتہ صدی میں جو صوبے بنے ہیں اُن کے
سنین قوسین میں تحریر ہیں
پیمانہ بحساب فی انچ تین سو میل
۳۰۰ ۳۵۰